نئی اردو غزل
ظفر اقبال سے علی زیرک تک

نئی اردو غزل

ظفر اقبال سے علی زیرک تک

غنی غیور

تفہیم پبلی کیشنز، راجوری ۔ جموں کشمیر (انڈیا)

©غنی غیور

NEYI URDU GHAZAL
Zaffar Iqbal Se Ali Zeerak Tak
Author By : Ghani Gayoor
ISBN:
Rs. 400/

نام کتاب : نئی اردو غزل : ظفر اقبال سے علی زیرک تک
مصنف : غنی غیور
سن اشاعت : ۲۰۲۱ء
تعداد : ۱۰۰۰
قیمت : ۴۰۰ روپے
سرورق : علی زیرک
زیرِ اہتمام : تفہیم پبلی کیشنز

کتاب ملنے کا پتہ
تفہیم پبلی کیشنز، راجوری ۔ جموں کشمیر (انڈیا)

نئی نسل

کے

نام

فہرست

پیش لفظ غنی غیور _____ 8

نئی غزل کے سب سے بڑے شاعر : ظفر اقبال _____ 23

جون ایلیا : سہل ممتنع روایتِ غزل کی زوردار آواز _____ 39

احمد مشتاق کی شاعری _____ 44

ثروت حسین :اردو غزل کی مشعل خود سوز _____ 46

وادی کشمیر کے ممتاز شاعر : حکیم منظور _____ 50

شہریار کی شاعری _____ 54

رفیع رضا : عہد حاضر کے اہم غزل گو شاعر _____ 59

جدید ترقی پسند شاعر : ظفر گورکھپوری _____ 65

کلاسیکی اردو غزل کی جان : شجاع خاور _____ 68

عباس تابش کی زندہ شاعری _____ 71

جدید شعراء میں درجہ اوّل کے شاعر : پرکاش فکری _____ 74

عابد مناوری، حامدی کاشمیری اور فاروق مضطر کی غزلیں _____ 78

عہد حاضر کے نمائندہ غزل گو شاعر : عرفان ستار _____ 90

افضال نوید : کریفٹ کے شاعر _____ 95
نعمان شوق، محمد اظہار الحق اور عمار اقبال کی شاعری _____ 98
کمار پاشی، عادل منصوری سلیم احمد اور محمد علوی کی شاعری _____ 103
رفیق راز کا شعری اسلوب _____ 109
پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری _____ 115
اقتدار جاوید کی شاعری _____ 117
مضطر عارفی : ایک نغز گو شاعر _____ 120
افتخار نسیم عفتی کی شاعری _____ 122
سعود عثمانی اور الیاس بابر اعوان کی غزلیہ شاعری _____ 125
حمیدہ شاہین، رحمان حفیظ اور سدرہ سحر عمران کی شاعری _____ 131
فرحت عباس شاہ کی شاعری _____ 133
زین شکیل کی شاعری _____ 136
اسحاق وردگ کی شاعری پر ایک طائرانہ نگاہ _____ 138
لیاقت جعفری اور نذیر قیصر کی غزلیہ شاعری _____ 142
شاہد ذکی کی شاعری _____ 145
افضل گوہر : لفظ کا سائیں اور معنی کا سوامی _____ 148
توقیر عباس اور ثناء اللہ ظہیر کی شاعری _____ 153
اختر عثمان کی شاعری _____ 158
کاشف حسین غائر کی شاعری _____ 163
ضیاء المصطفیٰ ترک کی شاعری _____ 166

حسین مجروح :اردو غزل میں نئے تجربات اور تغیر ہیئت کا مطالعہ _ 170
ذوالفقار عادل :''شرق مرے شمال میں''ایک مطالعہ _____ 173
شناور اسحاق کی شاعری _____ 175
جواد شیخ : حقیقی کیفیتوں کا شاعر _____ 178
مژدم خان کی شاعری _____ 184
علی زیرک اور صحیفہ انجیل کی شاعری _____ 187
کتابیات _____ 192

پیش لفظ

ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں
غالب

بقول النابغۃ الذبیانی ''أعذب الشعر أکذبہ ''

جھوٹ یعنی حقیقت کی منقلب صورت پر ہی شعر کی شعریت اور غذوبت کا دارو مدار ہے۔بعض ناخلفوں نے شاعری کو مقاصد کے تابع کیا اور اسے پندو مواظت کا پلندہ بنادیا اس طرح شاعری برزخ مذہب بن گئی جس کے ایک طرف طرف برہنہ سر شر تھا اور دوسری طرف کلاپوش خیر۔نیز مذہبی تعلیم کے علاوہ شاعری سائنسی سرد واقعیت کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔شاعری دراصل تجربے کی بازیافت ہے جو شاعر اپنے تجربات کی تازگی گرفت میں نہیں لاسکتا وہ ناکام شاعر ہے۔ ہر شاعر مختلف چیزوں کو اپنے ڈھنگ سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے دیکھیں صائب کیسے دروازہ کے بند ہونے اور کھلنے سے عمدہ مضمون پیدا کرتا ہے۔ یہ سماعت کا کمال ہے۔

تفاوت است میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

یعنی میرے اور تیرے سننے میں فرق ہے۔تو جسے دروازہ بند ہونے کی آواز سمجھتا ہے مجھے وہ دروازہ کھلنے کی آواز لگتی ہی شاعر چیزوں کو اجنبیا نے یعنی Unfamialr کرنے کے عمل سے گذار کر ان میں گردابیں، گرہیں اور اشکال پیدا کر کے تہہ داری لاتا ہے۔شاعری کا فن حقیقت کا علم نہیں سکھاتا بلکہ بصیرت کے ساتھ زندگی کی نقالی کرتا ہے اور حقیقی شاعر، حقیقت کے ہر اس تصور کو جس کے ہم گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ عادی ہوتے ہیں اور وہ یکسانیت کا شکار ہو کر گھسا پٹا اور فرسودہ ہو کر رہ جاتا ہے شاعر اسے اپنے ردعمل یا تجربہ نیز جدت طرازی اور بدیع الاسلوبی کے ساتھ ہر کلیشے کو درہم برہم کرتا ہے یعنی سے ایک طرح سے مروجہ نظام زبان کو بے نظم کر کے نئے بصیرت افروز تجربہ کے ساتھ نئی حسیت اور نیا لمس دے کر قابل قبول بنا دیتا ہے۔

Art is a way of experiencing the artfulness of an object, the object is not important.

بقول شکلوسکی، آرٹ کسی شے کو ادبیت کے ساتھ محسوس کرنا ہے وہ شے جسے محسوس کیا جاتا ہے بنفسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی مطلب یہ ہے اجنبیا نے کا سلسلہ پرانی روشوں کو توڑ تاڑ کر نئی روشیں پیدا کرنا ہے الفاظ کو نئے مفاہیم عطا کرنا ہے اشیا کو اجنبیا نے کی ٹیکنیک برتنا ان میں پیدا کردہ اشکال کے ذریعے قاری اور امتزاجی ناقد کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور تازگی سے ہمکنار اور سرشاری سے مالا مال کرتا ہے۔یہی وہ پیمانے ہیں جن سے ادب اور ادیب کی عمر اور قدر متعین کی جاتی ہے۔شک ادب کی راہ میں خداداد صلاحیت پہلی شرط ہے لیکن یہ جوہر ریاضت سے ضرور جلا پاتا ہے۔بقول بیدل۔

زقدِ خمیدہ شنیدہ ام کہ چو حلقہ شد بہ دری رسد

یعنی کسی دروازے علاقہ مند ہونے کے لئے لوہے کے سلاخ کے ٹکڑے کو گول

کڑا ابتنا پڑتا ہے۔ کڑا تخلیقی مراحل سے گذرنے کا استعارہ ہے اور اچھے شعر کی خاصیت یہ بھی ہے وہ بدلتے وقت کے ساتھ بھی اپنے نئے قاری کو اسکی ہمت اور استعداد کے مطابق تازگی کے احساس سے سرشار کرتا ہے اس کے ذہنی اپج اور شعور کو ترفع دیتا ہے اور پروان چڑھاتا ہے۔ نئے شعر اور نئی غزل سے مراد شعر کی نئی قرأت اور نئی تعریف ہے نئے اشعار پرانے ادب میں بھی بکثرت مل جاتے ہیں ہر ایسا شعر جس میں پیکر تراشی، جدلیاتی لفظ اور استعارہ میں سے کسی نہ کسی ایک صنعت کا بدیع الاسلوبی کے ساتھ استعمال ہو نیا شعر ہے۔

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

عشق کے بوجھ کو بارِ امانت کہا ہے جو کہ عمدہ استعارہ ہے اور دوسرے مصرع میں قرعہ فال کی ترکیب نے شعر میں مجبوری اور تحیر کی فضا بنا کر، شعر کو لمبی سانسیں عطا کر دی ہیں یہی نئی حسیت ہے۔ حس کاری و نادرہ کاری۔ روش عام سے گریز نہیں بلکہ روش عام کو پاش پاش کر کے تخلیقی و بدیہی فضائے خاکستری Gray Space کی صورتیں نکالنا ہے۔ اس کی وضاحت گوپی چند نارنگ نے ایک مقام پر یوں کی ہے۔

''طرفوں کے بیچ کے معنی کا دھندلانا یا معنی کی معمولہ انتہاؤں کے بیچ دھندلا عرصہ یا گرے ایریا پیدا کرنا جسکی تعبیر و تحلیل آسان نہ ہو، سامنے کی معمولہ بات کو اسطرح گھما دینا کہ معنی لٹو کی طرح گردش میں آجائے، معمولہ معنی کو بے دخل کرنا Subvert کرنا یا بے مرکز کرنا یعنی Decentre کر دینا''

(غالب،معنی آفرینی، جدلیاتی وضع،شونیتا،اور شعریات: صفحہ
۶۸۴ مصنف،گوپی چند نارنگ)

خواہی کہ عیب ہای تو روشن شود تو را. یک دم منافقانہ نشین در کمین خویش روایتی معنی کی تقلیب معمائی فضا، جدلیاتی نفی، اشکال Tension معنوی وضع کا مختلفانہ موعودہ تصورات اور متعینہ شعریات کا رد نئی شاعری مدھم لہجے کی شاعری ہے لفظی طمراق اور جزبہ نگاری سے اسے کوئی سروکار نہیں اسی طرح اکہری پرت کی جنسی، جزباتی اور مشاعراتی شاعری بھی فرومایہ ہی تصور کی جاتی ہے۔نئی غزل اس کی حوصلہ شکنی کرتی ہے ،میرا خیال ہے کہ نئی اردو غزل کی تاریخ ظفر اقبال سے مرتب ہوگی ظفر اقبال وہ عبقری شاعر ہے جس نے غزل میں زبردست تجربات کر کے اس کی ہئیت کو یکسر بدل دیا ان سے ناسخ ،غالب اور اقبال نے بڑے تجربے کئے اور بالخصوص غالب نے نئی شعری کائنات بنائی اور اردو غزل کو آسمان تک پہنچا دیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مزید تجربات کی چنداں ضرورت نہ رہی ہے اقبال نے اس میں ملی رنگ کی پیوند کاری کی لیکن غزل کا دائرہ سمٹ سا گیا تھا ایسا ہونا طے تھا ظفر اقبال نے اجتہاد کیا۔جب کوئی بڑا شاعر منظر عام پر آتا ہے تو معاصر شعرا کا ستارہ اقبال ماند پڑ جاتا ہے،ظفر اقبال نے اردو غزل کو اس ورطۂ حیرت سے باہر نکالا اسطرح غزل کا دائرہ محدود ہونے سے بچالیا مزید اس میں ہر قسم کے تجربات کئے اس طرح تمام رجعت پسندوں ،سکہ بند راویت پسندوں مذہبی اور دیگر ڈونگیوں کے منصوبوں کو تہس نہس کر دیا۔ظفر اقبال کا ایک شعر دیکھیں:

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

زیر نظر کتاب میں نے ظفر اقبال ہوں یا شہریار ہوں یا احمد مشتاق یا رفیع رضا الغرض

اہم شعرا کی غزل گوئی کا ہر پہلو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔نئی اردو غزل اپنی ماضی کی روایت کو ہر گز فراموش نہیں کرسکتی بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس کا ہر ابر ساختارہ Superstrucure یعنی نیا طرز اگلی اساسوں پر کھڑا ہوا ہے اور آئندہ بھی یہ سفر اسی نہج اور طریق پر جاری رہے آزاد غزل کوئی غزل نہیں اور اسی طرح نثری غزل بھی نام نہاد نثری شاعری کی طرح کبھی شاعری نہیں ہوسکتی اس قسم کے تجربے کرنیوالے پیدا ہوتے ہی ہمیشہ کے لئے مر گئے۔

یہاں کہنا بے جا نہ گا کہ ظفر اقبال نے عام بول چال کے الفاظ کو وہ آبرو بخشی جس کا جواب نہیں مثلاً کالک کے کنستر اور پرانے پوسٹر جیسے غلام بول چال کے الفاظ کو ملاحظہ کریں کس عمدگی سے استعمال کیا ہے کمال کی امیجری ہے۔اس قسم کی مثالوں سے ان کی شاعری بھری پڑی ہے۔

وہ ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں کالک کے کنستر
ادھر ہر خواب کا چہرہ نکھرنا چاہتا ہے
بہت بیزار ہے دیوار بھی اس سے الگ بات
پرانا پوسٹر خود بھی اترنا چاہتا ہے

ظفر اقبال

کوشش کی کی گئی ہے نئی اردو غزل میں شعری مثالوں کے ذریعہ ہی شعر اور شعریت کو فروغ دیا جائے۔میرا ماننا ہے کہ ایک اچھا شعر ترسیلی پرواز کے لئے اپنے اندر تمام بال و پر اور ساز و سامان اپنے ساتھ رکھتا ہے شعر کا متن اور اسلوب ہی اس کی تفہیم و ابلاغ اور تاثر کے ذمہ دار ہوتا ہے اس لئے میں یہی کہتا ہوں اچھا شعر ہماری یا کسی اور کی لچھے دار شرح کا ہر گز محتاج نہیں۔یہ بھی سچ ہے کہ ہر قاری کی علمی استعداد

برابر نہیں ہوتی اس لئے کہیں کہیں اشعار کی معنوی خصوصیات ابھارنے کی نیت سے اشارات رقم کر دیے ہیں۔

نئی اردو غزل میں عشق و محبت اور معاملات انسانی پر کافی تمرکز Focus ہوا ہے کئی نوجوان شعرا ابتذال کی حد پا کرتے معلوم ہوتے ہیں مشاعروں میں بھڑکیلے اشعار پڑھتے ہیں کیا کریں ہمیں بھی افسوس ہے کہ ان کے اشعار کی چمک دمک بھی حسیناؤں کے ملبوسات کی زری کی طرح جلد ہی ماند پڑ جاتی ہے۔لیکن سوچا جائے تو یہ بھی زندگی کے حسین منظر کا ایک پہلو ہے یہی وجہ ہے کہ سماجی حالات، ذاتی حالات اور افتادِ طبع شاعری کو متاثر کرتی ہے غزل میں ارضیت اور جنسیاتی پہلوؤں کا در آنا فطری عمل ہے۔غزل ابتدا میں انسانی معاشرہ اور سماج کی سخت گیری کے خلاف بطور ردعمل پیدا ہوئی ہے دراصل اس کے وحشی پن کا یہی راز ہے۔ بہرحال خون دل سے لکھا ہر شعر ضرور آبدار ہوتا ہے بعض لوگ اسٹیج کی اداکاری سے مشہور ہو جاتے ہیں لیکن کاغذ کی سطح پر سے انکے اشعار کبھی ابھرتے نہیں۔وہیں دبے دبے دم توڑ بیٹھتے ہیں۔

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہو گئے

جانثار اختر

ظفر اقبال کے بعد نئی اردو غزل نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ پرانے اساتذہ کے اکثر اشعار بھی ان کے آگے پھیکے اور ماند پڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

بلا کی چمک اس کے چہرہ پہ تھی
مجھے کیا خبر تھی کہ مر جائے گا

احمد مشتاق

یہ اک شجر کہ جس پہ نہ کانٹا نہ پھول ہے
سائے میں اس کے بیٹھ کے رونا فضول ہے

شہریار

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملی

احمد فراز

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب ہی نہیں تھے

افتخار عارف

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے

سلیم احمد

اڑ چلا وہ اک جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

نکل چلو کہ یہی وقت ہے رہائی کا
ہوا کی لہر بدن کا لہو ہے کتنی دیر

بانی

وہ فصل پک چکی تھی اب اس کا بھی کیا قصور
تجھ سے کہا تھا جیب میں چنگاریاں نہ رکھ

پریم کمار نظر

اپنے گیسو تو سنبھالو کہ کھلے جاتے ہیں
ورنہ الزام مرے شوق کے سر پہنچے گا

مظہر امام

بند پڑے ہیں شہر کے سارے دروازے
یہ کیسا آسیب اب گھر گھر لگتا ہے

کرشن کمار طور

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

وزیر آغا

کسی کلی کسی گل میں کسی چمن میں نہیں
وہ رنگ ہے ہی نہیں جو ترے بدن میں نہیں

فرحت احساس

جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیہہ
کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم وجد کا

وہاب دانش

ایسے ظالم ہیں میرے دوست کہ سنتے ہی نہیں
جب تلک خون کی خوشبو نہ سخن سے آئے

رئیس فروغ

بدن کے دونوں کناروں سے جل رہا ہوں میں
کہ چھو رہا ہوں تجھے اور پگھل رہا ہوں میں

عرفان صدیقی

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

کلیم عاجز

تنہائی کا اک اور مزہ لوٹ رہا ہوں
مہماں مرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں

شجاع خاور

سب نمازیں باندھ کر لے جاؤں گا میں اپنے ساتھ
اور مسجد کے لئے گونگی اذاں رکھ جاوں گا

محمد علوی

میرے ٹوٹے حوصلے کے پر نکلتے دیکھ کر
اس نے دیواروں کو اپنی اور اونچا کر دیا

عادل منصوری

دس بجے رات کو سو جاتے ہیں خبریں سن کر
آنکھ کھلتی ہے تو اخبار طلب کرتے ہیں

شہزاد احمد

عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہکار پر
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

شکیب جلالی

ہمارا گھر تو پہلے ہی واں گروی پڑا تھا
ہمارے ذہن بھی اسکے حوالے ہو گئے ہیں

اختر عثمان

نہ پکڑی قافلے کی جس نے انگلی
وہ بچہ سب سے آگے چل رہا تھا

پروین کمار اشک

یہ سارا جسم جھک کر بوجھ سے دہرا ہوا ہوگا
میں سجدے میں نہیں تھا آپ کو دھوکا ہوا ہوگا

یہاں تک آتے آتے سوکھ جاتی ہے کئی ندیاں
مجھے معلوم ہے پانی کہاں ٹھہرا ہوا ہوگا

دشینت کمار

دشمنوں کے درمیاں تنہا ٹھہرنا ہے مجھے
پھر وہی سقراط کا بہروپ بھرنا ہے مجھے

فاروق مضطر

آنکھوں میں رہا، دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

بشیر بدر

عالی طلوع فن کی نشانی یہی تو ہے
لفظوں میں ان کہی کا اثر جاگنے لگے

جمیل عالی

کھلی چھتوں کے دیئے کب کے بجھ گئے ہوتے
کوئی تو ہے جو ہواوں کے پر کترتا ہے

وسیم بریلوی

حساب نان ونمک بھی اسی سے کیوں یارب
تمام دن جو شکم کے تنور سے گذرا

لیاقت علی عاصم

آج کی رات نہ جانے کتنی لمبی ہوگی
آج کا سورج شام سے پہلے ڈوب گیا ہے

آنس معین

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں گا
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

مصطفےٰ زیدی

کیا کیا تھا حل مسئلہ زندگی میں لطف
جیسے کسی کا بند قبا کھولتے رہے

سراج الدین ظفر

خوش بچھڑ کر رہ سکا تو بھی نہیں میں بھی نہیں
ہاں مگر یہ مانتا تو بھی نہیں میں بھی نہیں

احمد فرہاد

خود کو دیکھوں تو پھوٹ پڑتا ہے
روتے روتے ہی قہقہہ مجھ میں

مبشر سعید

یہاں سے آگے قلمرو ہے حسن سادہ کی
علاقہ ختم ہوا مرے استعاروں کا

علی ارمان

میں پلٹ آیا تھا دیوار پہ دستک دے کر
اب سنا ہے وہاں دروازہ نکل آیا ہے

انجم سلیمی

بے بسی دیکھ تو فون ہاتھوں میں ہے
چند ہندسے کہ ڈائل نہیں ہو رہے

حنان حانی

میں ان دنوں تری آنکھوں کے اختیار میں ہوں
جمال سبز کسی تجربے میں لا مجھ کو

علی زریون

ہوائے شوق یہ منزل سے جاکے کہہ دینا
ذرا سی دیر ہے بس کارواں نکلتا ہے

دلاور علی آزر

تیری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول
یہ سہولت تو مجھے سارا زمانہ دیتا ہے

اظہر فراغ

درد کی دل پہ حکومت تھی کہاں تھا اس وقت
جب مجھے تیری ضرورت تھی کہاں تھا اس وقت

دانیال طریر

ہزاروں لوگ اس کو چاہتے ہونگے ہمیں کیا
کہ ہم اس گیت میں سے اپنا حصہ گا رہے ہیں

تہذیب حافی

میں اپنے خول میں خوش بھی تھا مطمئن بھی تھا
میں اپنی خاک سے نکلا خراب ہونے لگا

خالد کرار

اونچی عمارت سے مکاں میرا گھِر گیا
کچھ لوگ میرے حصے کا سورج بھی کھا گئے

جاوید اختر

ملوں تو کیسے ملوں بے طلب کسی سے میں
جسے ملوں وہ کہے مجھ سے کوئی کام تھا کیا؟

صابر ظفر

وہ ایک نافہ کہ ہے آدمی کے باطن میں
اب انجمن میں گرہ اس کی کون کھولے گا

خورشید رضوی

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

(منور رانا)

اپنے ہر سائے سے نکل کر بھی
میں تری روشنی میں زندہ ہوں

عمر فرحت

اس قسم کے اور بھی بہت سے نام ہیں جن تک میری رسائی نہیں ہوسکی۔ زیر نظر لگ بھگ کتاب میں وہی لوگ شامل کئے گئے جن کا کلام مجھے مختلف ذرایع سے مل سکا ہے۔ یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ اس سلسلہ میں میری اپنی مصروفیات اور تنگ دامانی ہی مانع رہی ورنہ یہ فہرست اور طویل ہوسکتی تھی فی الحال میں ایک سو

شعرا کے شعری نمونے، بھلے ہی وہ ایک شعر ہی کیوں نہ ہو، ٹھونک بجا اور جانچ پڑتال کر کے ہی زیرِ نظر کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ کسی رعایت کا قائل نہیں البتہ ممکن ہے غیر دانستہ طور کہیں کچھ کچھ کمی بیشی یا کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اور آئندہ میں ان کی تلافی کا پابند رہوں گا اسی امید کے ساتھ۔

آپ کا

غنی غیور

ظفر اقبال

نئی غزل کے سب سے بڑے شاعر

ظفر اقبال وہ نظریہ ساز شاعر ہیں جنہوں نے، بڑی حد تک شعری جمالیات کو متاثر کئے بغیر مروجہ حد بندیوں کو توڑ کر شاعری (نئی غزل) کی نئی بنیاد ڈالی۔ ان کے یہاں اچھے اور برے ہر قسم کے اشعار بکثرت مل جاتے ہیں۔

میں اندر سے کہیں تبدیل ہونا چاہتا تھا
پرانی کینچلی میں ہی نیا ہونا تھا مجھ کو

وہ دفینہ ہوں کہ مستور ہوں کب سے اب تک
توڑتا ہی نہیں آ کر کوئی دیوار مری

رو میں آئے تو خود ہی گرمئ بازار ہوئے
ہم جنہیں ہاتھ لگا کر ہی گنہگار ہوئے

تمام شہر سلامت ہے میرے گھر کے سوا
یقین کیجئے بھونچال ہی کچھ ایسا تھا

بدن کا سارا لہو کھنچ کے آ گیا رخ پر
وہ ایک بوسہ ہمیں دے کے سرخ رو ہے بہت

چہرے سے جھاڑ پچھلے برس کی کدورتیں
دیوار سے پرانا کلینڈر اتار دے

نئی ہوا میں مہک ہے پرانے پتوں کی
جو خاک ہو گئے پر شاخ سے جدا نہ ہوئے

شیر آ کے چیر پھاڑ گیا مجھ کو خواب میں
دم بھر کو میری آنکھ لگی تھی مچان پر

اپنے سوئے ہوئے سورج کی خبر لے جا کر
اس کمیں گاہ میں کرنوں کو پکڑتا کیا ہے

اہل نظر متفق ہیں کہ ظفر اقبال نے اپنے بارہ میں یہ مغالطہ خود ہی دیدہ دانستہ طور پر پیدا کیا ہے۔ بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ انہوں نے زبان کی ہئیت میں جو توڑ پھوڑ کا عمل روا رکھا ہے درست نہیں۔لیکن میرے خیال میں ہر بڑے شاعر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کلیشہ زدہ زبان کو تازہ دم بنانے کے لئے پرانے نظام الفاظ کو بدل ڈالے اور اس طرح زبان کو نئی قبا عطا کرے... سو اس کام میں ظفر اقبال نے Risk لیا ہے ظاہر ہے رسک لینے والوں کو خسارے بھی اٹھانے پڑ سکتے ہیں اور بیشمار فائدے بھی ہو سکتے ہیں۔اسی لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ظفر اقبال کا ایسا کلام جس پر بعض ناقدین معترض ہیں کو اگر منہا کر دیا جائے تو بھی ظفر اقبال کی''اب تک

''کی پانچ جلدوں سے سینکڑوں اچھے اشعار مل سکتے ہیں۔لہٰذا یہ کہنا بجا ہے۔ بی شک ظفر اقبال اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔

اب آئیے کچھ مثالوں سے ظفر اقبال کی شاعری کی سطحیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔شاعرانہ اختراع اور قوت ایجاد اور تخییل کی بے پایانی میں۔غالب و اقبال کے بعد اگر کوئی شاعر اس انحد کو پار کر سکا ہے تو فی الحال وہ صرف ظفر اقبال ہے۔ظفر اقبال نے اردو شاعری کو اس کے امکانات سے آگے پہنچایا ہے۔

نکل سکوں قفس اعتبار سے باہر
نہیں یہ بھی ہے مرے اختیار سے باہر

ریل عام لفظ ہے.....شعر

ریل کے زور شور سے سارا مکاں لرز گیا
اوس الگ نہ ہوسکی کھلتے ہوئے گلاب سے

ظفر اقبال نے پنجابی سندھی کشمیری بلوچی پشتو وغیرہ کے الفاظ سے جو پیوندکاری کا سلسلہ چلایا ہے وہ اردو کی تنگ دامانی کا مکمل و وافی علاج ہے۔تیرہویں صدی کے بعد کی اگر انگریزی کی تاریخ دیکھیں تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔زبانیں کس طرح پھیلتی ہیں یہ باتیں ہمارے نام نہاد ناقدین کی سمجھ میں آنے والی نہیں۔ البتہ ان تجربوں نے وقتی طور پر ظفر اقبال کی شاعری کو ناقابل تلافی زک پہنچائی ہے۔زبان سے چھیڑ چھاڑ کی مثال...نکلیا.....نکلا کا محرف ہے اور مقامی بولیوں میں مستعمل ہے.....(نکلیا بروزن فاعلن)

خالی خولی غبار نکلیا
اوس خاک سے جو سوار نکلیا

آیا جب دوسرا کنارا
دریا دریا کے پار نکلیا
مرگِ طبعی سے مرے، دیر کے بیمار تھے لفظ
اور پکڑا گیا میں صرف دوا دینے میں

نا چار ظفر گرمیٔ گفتار کے ہاتھوں
کچھ اور ہوئے جاتے ہیں الفاظ پگھل کر

بندھی ہے بھینس کھونٹے سے نہ گائے رکھتے ہیں
مگر ہم دودھ کے بارہ میں اپنی رائے رکھتے ہیں

محولہ بالا شعر میں " بھینس اور " گائے "، شاید ہی اس سے پہلے کسی شاعر نے غزل میں یہ الفاظ استعمال کئے ہوں گے ظفر اقبال نے نہایت خوبصورتی سے ان الفاظ کو امر کر دیا ہے۔ جہاں تک خارجی زبانوں کے الفاظ اور ان کے استعمال کا تعلق ہے۔ میں کہوں گا کہ کوئی بھی زبان اس قسم کے الفاظ کی آمیزش اور لین دین سے پاک نہیں بلکہ بڑی زبانوں کے ادیبوں نے نہایت مہارت اور فراخدلی سے (عندالضرورت یا کسی معقول وجہہ سے) دوسری اور خارجی زبانوں کے الفاظ لے کر اپنے ذخائر وسیع کیے اور اپنے اپنے ادب میں گرانقدر اضافے کیے۔ اور اب یہ سلسلہ جاری ہے اور اس کے برعکس بہت سی زبانیں اور ان کے شعراء اور ادباء اس قسم کے فورگروَنڈنگ کے عمل سے اجتناب کرتے رہے اور نتیجتاً وہ زبانیں سکڑتی چلی گئیں اور آخر میں روبہ زوال ہوئیں۔۔ مثلاً سنسکرت وغیرہ۔۔ سنسکرت محض پنڈتوں کی زبان تھی رفتہ رفتہ پراکرت ابھر کر سامنے آئی۔۔ بھگتی تحریک ستون بھگت کبیر نے اس

کو" کوپ جل" کہا تھا۔۔۔

ظاہر ہے کہ زبانیں آہستہ آہستہ کئی طریقوں اور ذرایع سے نئے الفاظ قبول کرتی رہتی ہیں اوراس کے برخلاف ان کے الفاظ فرسودہ ہوکر متروک بھی ہوجاتے ہیں ۔

کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

ظفراقبال نے اپنی اجتہادی اورغیر معمولی قوتوں کو بروئے کار لاکر اردو زبان وادب میں کئی مقامی بولیوں اورخارجی زبانوں کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔کہیں کہیں انکا یہ تجربہ کامیاب بھی ہوا ہے۔کہیں کہیں ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئیں۔ان سے پہلے مشہور،لطیف طنز ومزاح کے شاعراکبرالہ آبادی نے انگریزی کے ڈھیروں الفاظ اردوطنز ومزاح کی شاعری میں خوبصورتی سے استعمال کیے۔ یہ الفاظ صوتی اور معنوی اعتبار سے اردو کے اصلی اورحقیقی لگتے ہیں۔دوسری زبانوں کے الفاظ کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ یہ الفاظ حسن اورسلیقہ کے ساتھ برتے جائیں۔ ویسے بھی اردوزباں ہو یا کوئی اورزبانوں کا تشکیلی عمل کھچڑی کے بھاؤ جیسا ہوتا ہے۔

پہلے بھی کہہ چکا ہوں دوبارہ کہتا ہوں کہ کوئی بھی لفظ خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہو۔بنیادی طور پر اچھا یا برا نہیں ہوتا۔بات صرف اس کے حسن استعمال کی ہے۔بعض دفعہ دوسری زبانوں کے الفاظ حسن استعمال کی وجہہ سے موزوں اورمناسب لگتے ہیں اورالفاظ اس طرح بعض دفعہ رائج بھی ہوجاتے ہیں۔مثلاً اردو میں" لان" فٹ پاتھ۔

یہ سچ ہے کہ ظفراقبال نے گرے پڑے اورعام الفاظ کو غزل میں استعمال کرکے زبان کا دائرہ وسیع کیا ہے۔ظفراقبال کی شاعری لسانی تشکیل کی پہلی کامیاب اورعملی کوشش ہے۔شعر:

یہی وہ خطۂ خوابِ تماشہ ہے ظفر جس کو
کبھی دریائے رکھتے ہیں کبھی صحرائے رکھتے ہیں
''نشانیہ ہو کہیں پر نہ کچھ شناختیہ''

''دریا'' سے وزنی ضرورت پورا کرنے کے لئے دریائے ،صحرا سے صحرائے، نشان سے نشانیہ ،شناخت سے شناختیہ، آخت سے آختیہ ، دل گداختہ سے دل گداختیہ وغیرہ اس طرح کی لفظی توڑ پھوڑ کی مثالیں بہت ہیں لیکن اوپر دی گئی کچھ مثالوں کے علاوہ ہر جگہ اس قسم کا لفظی توڑ پھوڑ اور لسانی و ساختیاتی تغیر و تبدل اپنی تمام طرح جدت کے باوجود باعث تنافر بھی ہوا ہے۔

ظفر اقبال کے طرف داروں کا کہنا ہے انہوں نے اردو زبان میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزراروں نئے الفاظ تخلیق کئے ہیں۔ یہ نویلے الفاظ انہیں ان کے اشعار کے اندر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے دکھائے دیتے ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اس دیدہ و دانستہ عمل کو لسانی ادغام تحلیل و جذب کے عمل جو سبھی زبانوں کے اندر اندر ازل سے جاری رہتا ہے سے تعبیر کرتے ہیں

لسانی جذب کا عمل (Assimilation) تو غذا اور انسانی نظام ہاضمہ جیسا ہے۔

جس کے تحت دنیا کی زبانیں کسی ضرورت کے تحت عمداً یا غیر عمداً دوسرے الفاظ کو اپنے اندر سموتی رہتی ہیں۔اردو زبان کے ابتدائی دور کا عمل امیر خسرو وغیرہ کا کچھ ایسا ہی تھا۔مصرع امیر خسرو جس میں فارسی اور ہندوستانی زبان کی پیوندکاری کی گئی ہے۔

زحال مسکیناں مکن تغافل
دورائے نیناں بنائے بتّیاں

اسی طرح زبانوں کا یہ لین دین کا عمل آج بھی جاری وساری ہے لیکن یہ لین دین کسی ضرورت کے تحت یا اضطراری صورت میں ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا نہ کہ جبراً اسی طرح زبانوں کے اندر غلط العوام الفاظ جو کہ فصیح اور بہتر مانے گئے ہیں بھی رائج ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل انفرادی ہونے کے بجائے اجتماعی نوعیت کا ہوتا ہے اور یہی درست ہے۔ شاعری کی زبان محاورہ یا روزمرہ سے الگ یا برخلاف ہوتی ہے۔

ظفر اقبال کے مداحین نے ان کے لسانی توڑ پھوڑ اور تشدد کے عمل کی کئی تحویلات اور وجوہات بیان کی ہیں۔ کبھی تو وہ ان کی اس ذاتی اور انفرادی کوشش کو ادب یا تخلیقی فن کے تدریجی عمل میں امیر خسرو اور جعفر زٹل کا عمل قرار دیتے ہیں۔ اور انہوں نے پنجابی، سندھی، پشتو، کشمیری، گجراتی زبانوں کے بعض الفاظ قوافی بنا دیا یا پھر ان الفاظ کو اپنے کلام میں داخل کر کے مختلف زبانیں بولنے والوں کو بہم متحد کرنے کی افادی کوشش کی ہے اور اردو زبان کے الفاظ میں اضافہ کیا ہے۔ ظفر اقبال نے ملکی قومی علاقائی سطح پر زبانوں صوبوں اور لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور مافی الضمیر جاننے کا جتن کیا ہے۔ شاعری پر قومی یکجہتی اور (Solidarity) کی عمارت بنانا ہے بھی یا نہیں۔ یہ بحث ختم ہونے والی نہیں۔

ظفر اقبال صاحب کی شاعری میں قدم قدم پر موضوعاتی تکرار واقع ہوا ہے۔ اگر پوری شاعری بیک وقت سنجیدگی سے پڑھی یا سامنے رکھی جائے تو میرا دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے۔ میں کہوں گا کہ جدت کے باوجود ان کی شاعری موضوعاتی یکسانیت کا شکار ہو چکی ہے۔ انہوں نے متخیلہ موضوعات کو میر تقی میر کی طرح بار بار دہرایا ہے ان کے معروضیات پر الگ سے تنقیدی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ فی الوقت ان کا یہ تکراری عمل، ان کے کلام کے پھیلاؤ اور حجم کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ ممکن ہے کوئی نقد

گراس دہراؤ اور تکرار کو مکھی پر مکھی مارنا ثابت کر دے۔

محض زود گوئی یا بسیار گوئی سے کوئی بات نہیں بنتی شاعری میں مضامین کا بلند اور آفاقی ہونا لازمی عنصر سمجھا گیا ہے۔شاعری محض صوتی تلذز کا ساماں نہیں اور خالی ابہام کو بھی اس کی غایت نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔بطور صنعت" ابہام" کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔زود گوئی سے یہ تو ثابت کیا جا سکتا ہے کہ شاعر قادر الکلام ہے لیکن شاعری کا معیار موضوعات اور اسالیب سے ہی سے طے ہوتا ہے۔عالمی ادب اور تنقید کا یہی دستور ہے اسی طرح پستی مضامین بھی شاعری کے لئے مضر اور نقصان دہ ہوتی ہے۔" آج تک کسی نے مکھی (موضوع پر) شہکار نہیں لکھا اور نہ ہی کوئی لکھے گا۔ان تمام تلخ سچائیوں کے باوجود ظفر اقبال پچھلی صدی کے آخری نصف کے اہم ترین اور بڑے شاعر ہیں۔بقول شخصے:

''ظفر اقبال نے بعد میں آنے والوں کو متاثر بھی کیا اور گمراہ بھی''

سارا یہ کاروبار ملاوٹ کا ہے ظفر
اک چیز دوسری میں سمونا کسی کے ساتھ

زمین شعر میرے لمس کی رہے محتاج
میں اس کو ہاتھ لگاؤں جہاں، وہیں نئی ہو

ظفر اقبال کے کلام کا کچھ حصہ جسے بعض لوگ لسانی تشکیل کا عمل گردانتے ہیں۔اس اکھاڑ پچھاڑ اور علاقائی / مقامی الفاظ کی بھرتی کی مہم وغیرہ وغیرہ سے ایک طرف ہٹ کر ان کے کلام کا دوسرا حصہ نہایت ہی اچھوتا اور معیاری ہے۔

ظفر اقبال کے تخلیقی رویہ کی اہمیت، روایت سے انحراف کا دعویٰ اور اصلی صورت حال:

ظفر خود کر چکا ہوں جن اصولوں سے بغاوت
انہی کو رفتہ رفتہ عام کرنا چاہتا ہوں

جیسا کہ ظفر اقبال کے مطابق شاعری کی مکمل ترسیل کے قایل نہیں وہ شاعری کو تجریدی آرٹ کی طرح سمجھتے ہیں اور متاثرہ شاعری نقالی اور ماخوذ شاعری کے خلاف ہیں۔مزید ان کے مطابق شعر میں تازگی اور تاثیر ہونا چاہیے بے شک وہ اوٹ پٹنگ ہو، لیکن دوسروں سے مختلف ہو۔ان کے نزدیک تخیل کی بجائے کریفٹ اولیٰ ہے۔بعض دفعہ وہ شاعری کے ترجمہ کے بھی قائل نہیں۔

ملاحظہ ہوں یہ تک بندیاں ہماری ظفر
غزل چلائی ہے پھر قافیہ طریقے سے

''ان کا کہنا ہے کہ شعر میں کسی فعل اسم یا مصدر کی کمی شعر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے اور لفظ کے استعمال میں بقدر ضرورت من مانی کو اگر روا رکھا جائے تو ایک ہی لفظ کا غیر معمولی یا غیر متوقع غیر حقیقی استعمال معنوی لحاظ سے اس کی کایا پلٹ سکتا ہے۔"

یہ نہایت اہم نکتہ ہے۔اس بنا پر انہوں نے تجربے کئے ہیں اور وہ کہیں کہیں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں۔۔مزید اسطرح کا عمل اگر روا سمجھا جائے تو پھر جمع واحد، مذکر و مؤنث کی جھنجٹ (فارسی میں مونث و مذکر نہیں۔۔۔) سے بھی نکلنا چاہیے۔اگر ایسا ہو جائے تو اچھا ہے اور نیک رائے ہے۔زبان کا پورا ڈھانچہ بدلنا میرے خیال میں ممکن نہیں ہے۔

ان کا تخلیقی رویہ ان کی زبانی کیا ہے، وہ اس کو اپنانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ یہ الگ بات ہے لیکن انکی بہترین شاعری (منتخب اشعار) فارسی غزل کی فنی رسائیوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔اور وہی ان کی پذیرائی کا بہتر اور

دیر پا ثبوت ہیں۔

غزل میں تھے بہت آزادہ روظفر لیکن
تلازمات کی زنجیر سے رہانہ ہوے

ایک طرف وہ بطاہر وہ غزل کے افق کو وسیع کرنا چاہتے ہیں اور روایتی غزل سے دور بھاگنا چاہتے ہیں دوسری طرف فریب خوردہ خود اس کے دام تزویر میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔

ز شیخ شہر جاں بردم بتذویر مسلمانی
مدارا گر بہ او کافر نمی کردم چہ می کردم

ایک طرف ان کا خیال ہے کہ" شاعری کو پوری طرح سمجھنا شاعری کے ساتھ زیادتی ہے" ان کا کہنے کا مقصد ہے کہ کائنات جو کہ گوناگوں اشیا پر مشتمل ہے ضروری نہیں ہم اس میں ہر چیز کو مکمل طور پر سمجھیں.....اسی طرح نظم یا غزل کے شعر کی پوری ترسیل ضروری نہیں۔۔انکا خیال ہے ہ" غزل یا نظم کا شعر سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ لطف اندوزی" کے لئے ہوتا ہے"

وہ استعارہ اور ابہام کے قائل ہیں لیکن ان کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ تاہم ان کا اجتہاد اہمیت سے خالی نہیں۔

ان کی شاعری کا بیشتر حصہ استعارہ و ابہام سے خالی اور بھرتی کے اشعار (جو محض قافیہ پیمائی ہے سے مملو و معمور ہے۔ان کی شاعری میں کتنی علامتیں برتی گئی ہیں۔اور ابہام کی کس قدر مثالیں ملتی ہیں۔یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔۔اگر کوئی گننا چاہے تو انگلیوں پر گن سکتا ہے۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کا عشر عشیر بھی ان کے

اپنے وضع کردہ اصولوں اور معیار پر پورا نہیں اترتا۔بقول ان کے:

رہِ نیاز سے دھنتے ہیں لوگ سرورنہ
اثر تو آج بھی سارے سخن سے غائب ہے

کہا جاتا ہے ظفر اقبال ادعا و تعلی سے دور رہے ہیں۔لیکن انہوں تو کئی مقام پر اپنے "رنگ بیان" کی تعریف کی ہے۔۔۔اور اپنے مخصوص رنگ کو وہ سراہتے ہیں۔خود کو خاتم الشعرا سمجھتے ہیں:

مکمل اب ہوا شاعری کا دین سو ،اب
کچھ اس لحاظ سے بھی یہ کتابِ آخری ہے

خاتم الشعرا ہمیں مانیں نہ مانیں وہ ظفر
شاعری کے دین کو ہم نے مکمل کر دیا

ان کے کلام میں "یاوہ گوئی ،بے حجابی،عریاں نگاری،وغیرہ کی مثالیں حوالہ کے لئے ہر مجموعہ میں آسانی سے مل جاتی ہیں۔مثلاً

شروع کر دیا فٹ پاتھ پر بوس و کنار
قریب تھا مجھے تھانہ نہیں دکھائی دیا

الاسٹک ہیں بجائے ازار بند،ظفر
سہولیات محبت میں کیا اضافے ہیں

بتی جلا کے دیکھ لے سب کچھ یہیں پہ ہے
بنیان میرے نیچے ہے شلوار اس طرف

یہی وہ اشعار ہیں جن کی بنیاد پر ظفر اقبال کو اینٹی غزل کا علمبردار کہا گیا ہے اور

بے شک انہوں نے یہ کام روایتی غزل کا طلسم توڑنے کے لئے سرانجام دیااور وہ روایت توڑنے کے چکر میں کوئی بھی ہاتھ کر جاتے ہیں۔

ظفر اب کے سخن کی سر زمین پر ہے یہ موسم
بیاں غائب ہے اور رنگِ بیاں پھیلا ہوا ہے

معانی کے ملبے سے نکلا تو میں
گرامر کی دلدل میں دھنستا رہا

ظفر اقبال کا لسانی تشکیلی رویہ جو کہ اختلافی ہوتے ہوئے بھی اجتہادی درجہ رکھتا ہے اور اہمیت سے خالی نہیں ہے۔

بیٹھ جاتے ہیں دھول اور دھواں شام کے بعد
رات کے وقت زیادہ نظر آتا ہے مجھے

یہی محبت ہے ظفر
دودھ میں چھینٹا دہی کا

سارے تصوف کے سلسلے روحانیت کے طریقے یہی کہتے ہیں۔یہیں سے شروع ہوتے ہیں اور اسی نقطہ پر ختم ہو جاتے ہیں وضاحت یوں ہے کہ جب تک دودھ کو دہی کی" جاگ" نہ لگائی جائے دہی نہیں بنتا۔بالفاظ دیگر اسے پیوند کاری اشجار اور گردہ افشانی کے عمل سے بھی آپ سمجھ سکتے ہیں۔شاعری بھی ارتقائی اصولوں کی پابند ہے۔

اتنے مختصر اور جامع الفاظ میں اتنا بڑا اور وسیع موضوع ادا ہو گیا ہے۔

لو دے اٹھیں پھسلتی ہوئی انگلیاں ظفر
وہ آگ تھی کھلے ہوئے ریشم کے تھان میں

آجا سکیں بغیر اجازت کے بھی کبھی
لفظوں کے درمیان ہے" واہگہ" خیال کا

اپنے ہی پاؤں کی آواز سے ڈر جاتا ہوں میں
میں ہوں اور رہگزرے بیشۂ تنہائی ہے

یہ شعر پڑھ کر احساس یہ ہوتا ہے میر و غالب کے بعد بہت ہی کم شعرا نے اس قسم کی پر مغز غزلیں کہیں ہیں۔ اس مجموعہ میں اور بھی بہت سے آب دار اشعار ہیں۔

پیاسا کوّا جنگل کے چشمے میں ڈوب مرا
دیوانہ کر دیتی ہے پیڑوں کی مہکتی چھاوں

چمکتے چاند بھی تھے شہرِ شب کے ایواں میں
نگارِ غم سا مگر کوئی شمع رو نہ ملا

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ شاعری فیض احمد فیض، ناصر کاظمی اور منیر نیازی سے ذرا آگے کی شاعری ہے۔ یہاں کلاسیکیت اور جدت ایک ساتھ انتہا پر جا پہنچتی ہیں۔ یہ دو اشعار دیکھیں:

چمک اٹھے ہیں جو دل کے کلس، یہاں سے ابھی
گزر ہوا ہے خیالوں کی دیوداسی کا
فروغِ جسم نہ رنگینی قبا دیکھوں
جو دیکھ پاوں تو ان سب سے ماورا دیکھوں

''ادیب بے جان چیزوں کو ذی روح قرار دینے کی

جہت کے تحت باہر کے مظاہر سے ایک تعلق خاطر قائم کرتا ہے۔وہ بے جان اشیا میں جان پھونک کر انہیں زندہ کر دیتا ہے۔چنانچہ پتھر بولنے لگتے ہیں، چاند مسکراتا ہے، صحرا اسے اپنی جانب کھینچتے ہیں حتیٰ کہ کھڑکیاں منڈیریں اور سڑکیں بھی ذی روح بن کر اس سے مکالمہ کرنے لگتی ہیں۔اشیا کو روح تفویض کرنے کا یہ عمل جانداروں کو بھی انسانی سطح پر کھینچ لیتا ہے. چنانچہ درخت آہیں بھرتے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں اور پرندے انسانی محسوسات کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔حد یہ کہ سناٹا بولتا ہے ہوا کا دامن اسے مس کرتا اور سمندر لوری دیتا ہے۔گویا ادب اپنے لمس سے لخت لخت اشیا کو باہم مربوط کر کے کائنات کو اسکی یکجائی لوٹا دیتا ہے اور یہ بات عقل کے تجزیاتی عمل کا الٹ ہے۔''

''اقتباس از'' تنقید اور جدید اردو تنقید، مصنف وزیر آغا

کہاں خاکِ مدینہ اور کہاں خاکسترِ دل
کہاں کا پھول تھا لیکن کہاں پر آ کھلا ہے
یہیں تک لائی ہے یہ زندگی بھر کی مسافت
لبِ دریا ہوں میں اور وہ پس دریا کھلا ہے

ظفر اقبال کا محبوب بھی ہر زمانہ میں بے نظیر ہے انہوں پیکر بدل بدل کر جس استعارہ سازی سے حسن اظہار کیا ہے۔وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

مضتہ الدہور و ما أتین بمثلہ
فلما أتی فعجزن عن نظرائہ

المتنبی کا محبوب مجازی تھا۔اس نے مبالغہ (Hyperbole) سے اپنے محبوب کا ہر زمانہ میں بے مثال ثابت کیا ہے۔جبکہ ظفر اقبال نے لطیف استعارات سے کام لیا ہے۔

''کہاں کا پھول تھا لیکن کہاں پر آ کھلا ہے''

گلشن لولاک کے پھول کو آخری زمانہ میں جو خراجِ تحسین پیش کی گئی ہے۔

سنو گے لفظ میں بھی پھڑ پھڑاہٹ
لہو میں بھی پر افشانی رہے گی

ظفر، میں شہر میں تو آ گیا ہوں
مری خصلت بیابانی رہے گی

نہیں کہ ذوقِ سماعت بیاں کے بعد ہوا
زباں کا معجزہ قطعِ زباں کے بعد ہوا

حاصل بحث یہ ہے کہ ظفر اقبال نے شاعری کے مروجات یا روایتی نظام میں بہت توڑ پھوڑ کی ہے وہ اپنی جدت طرازیوں کے باعث متنازعہ (Controversal) بھی ہیں ۔یہ حقیقت ہے کہ جب بعض بڑے آرٹسٹ، شاعر، سائنسدان جب جب اپنے بڑے آرٹ یا بڑے افکار کے ساتھ اپنے طبیعی دور سے آگے یا پہلے پیدا ہو جاتے ہیں یا جب جب وہ غیر معمولی تجربات کر بیٹھتے ہیں تو ان کی معاصر روایت پسند اکثریت Majority انکی مخالف ہو جاتی ہے۔

ایسا المناک صورت جسے The Tragedy of a Man Ahead of

His Time کہا جاتا ہے ۔ظفر اقبال بھی اسی کے مصداق ہیں ۔ظفر اقبال کے اکثر تجربات بھلے ہی ناکام ہوئے ہیں اس کے باوجود یہ بات طے ہے کہ ظفر اقبال کی تجرباتی نوعیت کی ٹاٹ نما شاعری میں عمدہ ابریشم کے کئی پیوبند بھی لگے ہوئے ہیں ان کی منتخب شاعری ہے ۔انہیں معاصرین پر فوقیت دینے کے لئے کافی ہے، اگلے کئی سالوں تک شاید ہی کوئی شاعر ان سے یہ بازی جیت سکے ۔اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی نصف صدی پر پھیلے ہوئے ادبی منظر نامہ پر ظفر اقبال کی زبان کا سورج ہی دکھائی دیتا ہے اور اس کی پھینکی گئی زرتار کرنوں کے جال سے جو تنوع اور رنگارنگی ظہور میں آئی ہے ۔اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے معاصر شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا ۔ایسی "سرکشی" کے کیا کہنے ۔شعر:

سر کش سہی، فی الحال تو سر بھی نہیں رکھتے
کیا اہلِ نظر ہیں کہ نظر بھی نہیں رکھتے

ظفر اقبال زورگوئی کے باوجود قنوطیت کے شکار ہیں اور گہری اداسی کے قابل بھی۔

مجھ میں ہیں گہری اداسی کے جراثیم اس قدر
میں تجھے بھی اس مرض میں مبتلا کر جاؤں گا

ظفر اقبال اپنے عیبوں سے آگاہ ہیں انہوں نے لسانی توڑ پھوڑ کے تجربات جان بوجھ کر کئے ہیں ۔شعر دیکھیں:

جہاں جہاں مرے عیبوں کی آندھیاں ہیں ظفر
وہیں میں لے کے چراغِ ہنر بھی آتا ہوں

جون ایلیا، سہل ممتنع روایتِ غزل کی زوردار آواز

جون ایلیا نے جہاں ایک سہل ممتنع روایت کی احیا کی جاندار کوشش کی وہیں شاعری بالخصوص میں اینٹی غزل کے جراثیم بھی چھوڑ دیے یہ جرثیم لاہور کی بڑے شاعروں کو کچھ ایسے لگے کہ معنوی طور پر انہیں بھی پرلے درجے کا "ایلیائی" بنا دیا ۔جون ایلیا کی دوسری کتاب کا عنوان "یعنی" (ظفر اقبال نے اپنے مضامین کا عنوان غالباً اسی کے ردعمل یا براہ راست نتیجہ میں ہی "لایعنی" رکھا) جون ایلیا اپنے اس شعری مجموعہ کا انتساب کچھ یوں کرتے ہیں "اپنی بہن سیدہ شاہِ زناں اور بھائی سید محمد عباس کے نام" میں ان مبالغہ آمیز انتسابی کلمات پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا صرف اتنا کہوں گا کہ ہمارے شعراء کے ذہنوں میں بھی ہمارے عوام کی طرح بعض عقائد کا خبط سوار رہتا ہے یہ نئی بات نہیں ۔اس کے علاوہ جون ایلیا کی نفسیات میں نسوانیت ہی نہیں بلکہ زنانہ پن بھی سرایت کر چکا تھا۔زاہدہ حنا تو خیر الگ رہیں انہوں نے اپنے غزل نما منظومات کی ردیف "فارہہ" رکھی ...ایک جگہ منظوم غزل نما کلام کا عنوان ہے "میرے غصہ کے بعد بھی"

فارہہ کیا بہت ضروری ہے
ہر کسی شعر ساز کو پڑھنا

ایک اور ردیف " تتَنا ہو یا ھو" میرے خیال میں ظفر اقبال نے اردو غزل میں تجربات کے نام پر جو بیراہروی اختیاری کی ہے دراصل اسکا سہرا جون ایلیا کے سر جاتا ہے.. ''کہن سَنَن'' کا استعمال.

نہیں مطلب کہن سنن تجھ سے
زندگی ہے تو بیقراری ہے

حضورِ زیر ناف یہ دل
عجب کم بخت تھا نامرد نکلا

''چرکینیت'' کا رنگ عیاں ہے۔جون ایلیا کی شاعری گنجلک اور بے مزہ تراکیب سے مملو ہے۔بعض تراکیب :

اوقیانوسِ بیکران خیال، تلوے خاریاں، حالت ہائے کول جیجیم جہاں سوزی، زوزۂ گفتار، شور سامعہ آزار، سگ ولکرد وغیرہ۔غزل کا ایک مصرع ''کہیں سے ایک سگِ ولگرد نکلا'' ایک اور نام نہاد اور برائے جدید غزل سے شعر۔

آپ مجھ کو بہت پسند آئیں
آپ میری قمیص سی جیے گا

ایک اور نرالی غزل سے شعر:

مہذب آدمی پتلون کے بٹن تو لگا
کہ ارتقا ہے عبارت بٹن لگانے سے

''پیالۂ ناف'': یہ ترکیب جون ایلیا نے بیسیوں اشعار میں دہرائی ہے۔

زندگی ہے شرابیوں کی حرام
قدرِ حرمت ہے وہ پیالہ ناف

پیالہ ناف کو جون ایلیا نے ایک ہی غزل نما منظومے کے۔ بارہ اشعار میں بطور ردیف لایا ہے۔ایک اور شعر دیکھیں

یار پستاں تو گوشت پارے ہیں
رمزِ نزہت ہے وہ پیالہ ناف

ایک اور مقام پر... ناف کا ذکر یوں کیا ہے :

ہم سے چھنا ہے ناف پیالہ ترا میاں
گویا ازل سے ہم صفِ لب تشنگاں کے تھے

ایک اور جگہ.. شعر

ناف پیالہ نہ آپ چھلکائیں
اس کو ہم پر حلال تو رکھیے

ایک مصرعہ دیکھیں :

یہ بالا کیا ، یہ ژرفا کیا ، یہ پہنا کیا ؟

کوئی معنی نہیں یہاں" بالا" اور ژرف کا استعمال کتنا نامانوس ہے۔درخت زرد .....(شجرہ)''درخت زرد'' کے عنوان سے کسی" زریون " کا نام بھی لیا ہے... ایلیا نے اس طویل نظم میں اسکی ماں (راس) کی بھی اچھی طرح خبر لی ہے۔خیالات کی کڑیوں الوہیت سے ملائی ہیں اور دنیوی مسائل کی گتھیوں کے بند مونہوں کو بھی کھولنے کے لئے ناخن اور دانت استعمال کرنے کی لاطائل سعی کی ہے۔طویل ترین منظومہ کی شروعات یوں کی ہے۔

نہیں معلوم زریون اب تمہاری عمر کیا ہوگی
وہ کن خوابوں سے جانے آشنا نا آشنا ہوگی

ایک شعر دیکھیں:

کہیں اپنے سوا یعنی کہیں اپنے سوا ٹھہرو
تم اس Absurdity میں اک ردیف اک قافیہ ٹھہرو

میں نے اس طویل نظم کی غواصی کی لیکن شاید یہ میری کم ہمتی تھی کہ جواہر معانی کچھ زیادہ نہیں ہاتھ آسکے ہیں۔کہیں کہیں لگتا ہے کہ شاعر کے جذب درون کے سر ریز ہوتے وقت،اس کا کچھ حصہ دل و دماغ کے اندر ہی رہ گیا ہے اور دیگر کچھ حصہ،خیال کے دھاروں سے الگ جا پڑا ہے۔لہذا نظم تشنگی کا شکار ہوگئی ہے۔مجموعی طور پر یہ فقط پراگندہ خیالی اور ذہنی انتشار ہی متصور کی جائے گی البتہ الفاظ کے روڑے اور بجرے بحر میں ڈھل گئے ہیں۔سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا معلوم ہوتا ہے آب شیریں کے سوتے گدلے نالوں کی تاس میں گم ہو گئے ہیں۔کچھ سمجھ آتا ہے اور کہیں کچھ نہیں بھی سمجھ آتا۔ابہام باضابطہ کی بھی بات الگ ہے۔وہ قواعد وضوابط کا پابند ہوتا ہے لیکن یہاں شاعر کے تحت الشعور کے تصادم نے شعور کو بھی دھندلا دیا ہے۔

کہیں پدرم سلطان بود کا ڈھول پیٹا گیا ہے اور کہیں خود کو" سگان خوک زاد برزن و بازار بے مغزی" کہا ہے۔وہی شجرہ جو عورت کی اہمیت کو فراموش کر کے ہمارے اسلاف نے صدیوں پہلے ہمارے ہاتھوں میں تھمایا تھا۔بقول ایلیاؔ انسان کا تولیدی نظام فقط مرد کی صلب سے متعلق ہے نیز عورت محض برتن ہے یعنی جینس کے ٹرانسفر میں عورت کا کوئی رول نہیں جھوٹے مکتب زدہ شاعروں کو کوئی اتنا تو بتاتا کہ Genetics کیا ہے کیریکٹر صرف مرد سے منتقل نہیں ہوتے بلکہ اس سلسلہ میں دوسرا

نصف یعنی عورت بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ مرد اور عورت تو قیمی کے دو پر ہیں ۔ ڈامننٹ اور ریسیو ایک پیچیدہ عمل ہے ۔تاریخ بتائے کہ قدیم عورتوں کے نصب نامے کہاں گئے ۔کیا کسی محقق یا باحث نے آج تک انہیں مرتب کیا؟ خیر یہ انکشافات و تحقیقاتِ علوم جدیدہ کی ۔ان بیچارے بے مغز اور خبطی شعرا کی بلا جانے ۔انہی ٹامک ٹوئیوں میں نظم کا تسلسل برقرار نہ رہ پایا ہے ۔منظومہ کے دو اشعار :

تناتن تن تناتن تن تناتن تن تناتن تن
تناتن تن نہیں محنت کشوں کا تن،نہ پیراہن
یہ سالے کچھ بھی کھانے کو نہ پائیں گالیاں کھائیں
ہے ان کی بے حسی میں تو مقدس تر حرامی پن

مجموعی طور جون ایلیا کی شاعری انسانی شعور کو بلند نہیں کرتی ۔بلکہ ہمارا ذہن، ماضی کی اندھی غاروں کی طرف ذہن لے جاتی ہے ۔اور کہیں جون ایلیا کی نظر عصری مسائل سے گھائل ہو کر رہ جاتی ہے ۔لہذا جون ایلیا کی شاعری کی افادیت سہل ممتنع کی روایت کے استحکام کی ایک پر زور آواز کے سوا کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی ۔ یاد رہے آواز کتنی ہی زور دار کیوں نہ ہو ۔اس کا مقدر ہوا میں تحلیل ہو جانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔البتہ وہ جس سے جدلیاتی الفاظ کی حامل وہ آواز زندہ رہتی ہے لیکن جون ایلیا کی شاعری میں ایسے جدلیاتی الفاظ سرے سے مفقود ہیں ۔

اے زندگی تیرے تسلسل میں ہم نے
ایسے لوگ بھی کھوئے ہیں جو سانس کے مانند تھے

احمد مشتاق کی شاعری

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

ہوئی ہے شام آنکھ سے آنسو رہا ہوئے
یہ وقت قیدیوں کی رہائی کا وقت ہے

کہیں ملے وہ سرِ رہ تو لپٹ جائیں
بس اب تو ایک ہی رستہ دکھائی دیتا ہے

ہنر کی بات جو پوچھو تو مختصر یہ ہے
کشید کرتے ہیں آگ اور دھواں بناتے ہیں

یہ پانی خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

رہ گیا مشتاق دل میں رنگ یادِ رفتگاں
پھول مہنگے ہو گئے قبریں پرانی ہو گئیں

میں تجھے بھول نہ جاتا تو خزاں ہی رہتی
شاخ پر پھول تری یاد دلانے آیا

کتنے گھر باقی ہیں کتنی دستکیں باقی ہیں اور
تیرا دروازہ کھلے گا کتنے دروازوں کے بعد

بیسویں صدی کی سن ستر کے بعد کی جدید اردو شاعری (غزل) کی بلندی کے دو کناروں پر دو شاعر کھڑے دکھائی دیتے ہیں ایک طرف بلند چوٹی پر ظفر اقبال ہیں ۔ جو اپنی جدت طرازیوں اور نئے تجربات کے نیزے لئے شاعروں کے لئے چیلنج بنے ہوئے ہیں اور دوسری ایسی بلند چوٹی جس پر یاس وحرمان کی دھند چھائی ہوئی ہے اس زندگی کے معاملات کی خوبصورتی لئے احمد مشتاق کھڑے ہیں ۔احمد مشتاق نے جس سلیقے سے اشعار کہے ہیں سن ستر کے بعد اسکی نظیر شاید ہی مل سکے ۔احمد مشتاق کی ہی طرح ظفر اقبال واحد شاعر ہے جس کے ہاں بکثرت اچھے اشعار مل جاتے ہیں ۔لیکن نئے تجربات کی بنا پر ظفر اقبال کا پلڑا بہت بھاری ہو جاتا ہے انہوں نے شاعری کی ہئیت سے جو چھیڑ چھاڑ کی وہ جدید شعرا کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوئی ہے ۔ باقی بھی اسی لیول کے شاعر ہوتے لیکن زندگی نے وفا نہ کی ۔اور وہ اپنے مقام منتہا پر نہ پہنچ سکے ،بعض لوگوں کے مطابق احمد مشتاق کی شاعری فنی اعتبار سے پختہ ہے ،لیکن میں ذاتی طور پر اس رائے سے متفق نہیں ہوں ۔

ثروت حسین اردو غزل کی مشعل خود سوز

ثروت حسین بنیادی طور پر عشق و محبت کے شاعر ہیں ۔ان کی شاعری پڑھ کر دنیا و مافیہا سے محبت بڑھ جاتی ہیں ۔وہ مظاہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں شاعری میں استعمال کرتے ہیں ۔شاید عشق و محبت کی درونی کیفیت ان کی شاعری میں در آئی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ مشقت سے نہیں جوڑے گئے بلکہ وہ خود بخود اپنے گھونسلوں میں آبیٹھے ہیں ۔وہ گھسے پٹے الفاظ کو اپنی بصیرت سے صیقل کرتے ہیں ۔ نیچے دیے گئے شعر میں " کرن " کی میزبانی بالکل اچھوتا خیال ہے ۔شعر :

دل میں رکھ لو کوئی کرن ثروت
اور تا صبح میزبان رہو

لڑکی گھاٹ پر کھڑی ہے عام سا واقعہ ہے لیکن وہ اس واقعیت کو منقلب کر کے پانی کی سطح پر جلتا چراغ بنا دیتے ہیں خیال کو اس بلندی پر پہنچا دیتے ہیں جس سے آگے تصور کرنا بھی محال ہے ۔

لڑکی کوئی گھاٹ پر کھڑی تھی
پانی پہ چراغ جل رہا تھا

ستاروں کا اذان سننا کس قدر شعری تازگی اور دوشیزگی کا احساس دلاتا ہے ۔نئی

اردو غزل ہر معمولہ موقف اور مقبول عام روایتی شعریات کا رد کرتی ہے۔اور حقیقت کی نئی تعبیریں قائم کرتی ہے۔ستاروں کے اوجھل ہونے کی نئی تعبیر۔

وہ راز داں وہ دوست ہمارے چلے گئے
سن کر اذانِ فجر ستارے چلے گئے

تنہائی کو الاؤ کہنا کتنا معنی خیز ہے، معنی کی نئی کفیات کی تشکیل کو راہ کھول رہا ہے۔ لفظ الاؤ پوری شعری فضا پر چھا جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے الاؤ سے اٹھنے والی لپٹیں پرسوز نغموں میں متشکل ہو جاتی ہیں۔شعر:

تنہائی کے الاؤ سے روشن ہوا مکاں
ثروت جو دل کا درد تھا نغموں میں ڈھل گیا

ثروت مری تنہائی کا نابینا کبوتر
اس بام تلک کون سی تدبیر سے پہنچا

یہ آگ دور کسی دشت میں لگی ہے مگر
ہمارے شہر سے ہو کر دھواں گزرتا ہے

دل چاہتا نہیں در و دیوار چھوڑیے
اس نے ہزار پاؤں کی زنجیر وا بھی کی

کسی کے شہر میں مانند برگ آوارہ
پھرے ہیں کوچہ بہ کوچہ ہم اپنے خواب لئے

رکھ لیتے ہیں دل بیچ زباں پر نہیں لاتے
کچھ تیر ہیں ایسے جو کماں پر نہیں لاتے

شام کے وقت سورج ڈوبتا ہے یہ ایک حقیقت بدیہی ہے نیچے دیے گئے شعر کے مصرع اولی میں اسی کا ذکر ہوا ہے۔لیکن ثروت حسین نے دوسرے مصرع میں اس روایتی تصور اور معنی کا رد کر کے نئے معانی پیدا کئے ہیں یہی شعری نادرہ کاری ہے۔شعر

جب شام ہوئی میں نے قدم گھر سے نکالا
ڈوبا ہوا خورشید سمندر سے نکالا

صوفیہ،ثروت حسین کی،معشوقہ پنجاب سے موج چناب کی طرح ان کے اشعار کی آب بڑھاتی رہی اور وہ عشق کی نارسائی سے پیدا ہونے والے سوز وگداز میں ڈوب کر پگھلتے رہے،انہوں نے خود کو "مشعل خود سوز" کہا ہے انکے کلام میں عشق کی نارسائی کی کیفیت جا بجا ملتی ہے اور حسرتیں چیخ چیخ کر دم توڑتی دکھائی دیتی ہیں۔اشعار:

پہنچا بڑے ارمان لئے دشت فلک تک
ہاتھوں میں مگر ایک بھی تارا نہیں آیا

گرد جمتی چلی جاتی ہے سبھی چیزوں پر
گھر کی تزئین تو افراد کیا کرتے ہیں

ثروت حسین نے تمایلات جنسی کا اظہار استعاراتی انداز میں کیا ہے۔ویسے بھی ثروت حسین کی شاعری Routine یعنی معمولہ سے ہٹ کر ہے وہ اپنے اسلوب اور حسن سلوک سے الفاظ کو آبرو اور وقار کی نئی نئی خلعتیں بخشتے ہیں۔

خوش لباسی ہے بڑی چیز مگر کیا کیجے
کام اس پل ہے ترے جسم کی عریانی سے

وہ اک سورج صبح تلک مرے پہلو میں
اپنی سب ناراضگیوں کے ساتھ رہا

تو نے چھپا کے رکھے ہیں مہتاب کس لئے
جانِ جہاں ہاتھ گریبان سے اٹھا

وادی کشمیر کے ممتاز ترین شاعر : حکیم منظور

بہت پہلے 'آجکل' کے کسی شمارے میں حکیم منظور کی ایک غزل کے دو تین اشعار پڑھے تھے یہ اشعار ان کے مشہور مطبوعہ کتابوں میں نظر سے نہیں گزرے۔ یہ اشعار میرے لئے لذتِ کام و دہن اور ذوق سلیم کی غذا ہیں اچھے شعر کی نشانی ہے وہ ایک سچی قلبی واردت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس کا قاری پڑھتے وقت عین اسی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے جس سے شعر کا خالق دو چار ہوا تھا۔ یہاں خوشبو کو علامتی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

خوشبو کا کوئی گھر ہے نہ کوئی گھرانہ ہے
اس کا سخی مزاج کہ پیغمبرانہ ہے

یہاں مذکورہ بالا شعر میں۔خوشیو کے مزاج کو سخی اور پیغمبرانہ کہنا واقعی شعریت سے بھرپور ہے۔اسی غزل کا ایک اور شعر

ثابت ہیں بس اسی سے سمندر کی وسعتیں
وہ ایک قطرہ جس کی ادا باغیانہ ہے۔

شعروشاعری کے متعلق اشپینگلر کہتا ہے :

''ہر معاشرہ اپنی مخصوص اوضاع پیدا کرتا ہے جنہیں صرف اس معاشرے کے

اندر رہ کے سمجھا جاسکتا ہے۔''

اس لئے شعر تو پوری تہذیب کی پیدا کردہ چیز ہے۔ شاعری ضروری نہیں اپنی تہذیب میں پائی جانی والی سب اقدار اور صداقتوں کی موکد نمائندہ ہو بعض دفعہ شاعر اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے اور وہ تخلیقیت کو بروئے کار لا کر نئی اقدار بھی تخلیق کرتا ہے کیونکہ وہ حقیقت کا متلاشی ہوتا ہے نہ کہ مقلدِ محض۔ بہر حال روایت سے انکار کی صورت میں بھی وہ اپنی روایت اور تہذیب سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اسکا انکار بھی کسی روایت پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک اور شعر

آفتابوں کا ں بڑھاپا برفزاروں کی خوشی
سبز پتوں کے لئے آزار جاں لکھا گیا
برفزار زمانے کی سرد مہری
اور سبز پتے نئی نسل کی علامت ہے

یہاں آفتاب روشن خیال بزرگوں کی علامت ہے۔

نئی غزل میں بہت سی مغربی تحریکوں کے زیر اثر تجربے کئے گئے ہیں لیکن شاعری میں کسی خیال یا پیغام کا ہونا ضروی ہے اور کسی بھی طور اس حقیقت سے پیچھا نہیں چھڑایا جاسکتا ہے۔ میرا ماننا ہے شاعری نہ تو مونالیزا کی نقاشی شدہ تصویر ہے اور نہ ہی تان سین کی موسیقی شاعری تو الفاظ کی تنظیم و ترتیب سے بنایا گیا ایک قلعہ موہوم یعنی imaginary castle ہے۔ بقول محمد حسین عسکری:

''ادب پارے میں مجبوراً مادی ہیت کا انحصار معنوی معنوی
ہئیت پر ہوگا لیکن معنی کا تصور اقدار کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا
معنی کی تربیت کے لئے صرف حسن اور بدصورتی کے

معیاروں سے کام نہیں چلے گا۔ اس میں نیکی ور بدی سچ اور
جھوٹ کے تصورات کا دخل لازمی ہوگا تو جس چیز سے بچ کر
بھاگے تھے اس سے پھر دو چار ہونا پڑا فنکار چاہے یا نہ
چاہے اخلاقیات کا جُوا اس کی گردن پر رکھا ضرور رہے گا۔''

حکیم منظور کے منتخب اشعار:

کوئی پیام اب نہ کوئی پیمبر ہی آئے گا
وہ شب ہے آسمان سے پتھر ہی آئے گا

تجھ پہ کھل جائیں گے خود اپنے بھی اسرار کئی
تو ذرا مجھ کو بھی رکھ اپنے برابر میں کبھی

اس سے کیا پوچھتے ہم اپنے معانی منظور
پھول کھلتے نہیں دیکھے کسی بنجر میں کبھی

مجھ سے دو گز پر سدا اونچا رہے گا آسماں
کیا ضرورت ہے کہ بے جا قد کو میں اونچا کروں

اس آفتاب سے اس دن مصالحت ہوگی
میں اپنے رنگ میں جب اس کو ڈوبتا دیکھوں

اب کے میرا کعبہ دل دشمنوں کی زد پہ ہے
پھر مدد کرنا ابابیلوں کے لشکر بھیجنا

گرجتے بھاگتے دریا سے کیا غرض ہم کو
ابلتے بولتے چشموں کی قربتیں لکھنا

خبر کہ اندھی ہے دینا بشارتیں اپنی
سڑک کہ شیشہ ہے پتھر مسافتیں لکھنا

بے ثمر ہوکر سبھی نظروں میں حرف شب ہوا
ہاں مگر بوڑھا شجر میرے لئے مکتب ہوا

مدت ہوئی کہ سیب اور اخروٹ کی جگہ
پکتی ہیں پیڑ پیڑ یہاں سازشیں کئی

شہریار کی شاعری (غزل گوئی)

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

سورج کا قہر صرف برہنہ سروں پہ ہے
پوچھو ہوس پرست سے وہ کیوں ملول ہے

قافلے نیند کے آئے ہیں انہیں ٹھہرا لو
ورنہ یہ دور بہت دور نکل جائیں گے

آنکھوں کو سب کی نیند بھی دی،خواب بھی دیئے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات

سمندروں کا سفر ختم ہوگیا ہوتا
جدا نہ کرتے جو کشتی کو بادبان سے ہم

مانا کہ دھوپ سخت ہے ،میں سر برہنہ ہوں
بے حس شجر کے سائے میں کیسے پناہ لوں

یہ دیکھو آگئی میرے زوال کی منزل
میں رک گیا مری پرچھائیں چلتی جاتی ہے

ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراثت میں ملی ہے
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ادب کی ایک تعریف تنقیدِ حیات بھی ہے۔ادب ایسا ہو جو زندگی سے علاقہ مند ہو،اس میں تفکر کی بو باس ہو،اس میں بیان کئے گئے موضوعات میں آفاقیت ہو،ہر ادبی فن پارے میں حسن کا جوہر ہو،اور اس میں مہرِ حیات کی کرنوں کا ارتعاش و ارتکاز ہو۔

شہریار کی شاعری میں کشادہ قلبی اور کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے۔اس میں انسانی شعور کی سطح بلند کرنے کا جزبہ ملتا ہے۔شہریار نے پرانی علامتوں کے تکرار اور گھسے پٹے تلازموں کے بجائے تازہ علامتیں اور الفاظ کے نئے تلازمے استعمال کئے ہیں۔ان کے ہاں روایت اور جدیدیت کے امتزاج کی مثالیں بکثرت ملتی ہے اور جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے۔بعض حضرات نے ناصر کاظمی کے بعد ان کا نام اعتدال پسند جدید شاعر کے طور پر لیا ہے۔غزل کی صداوں کے جنگل میں انکی صدا مختلف النوع ہے۔انہوں نے غزل کے وقار کو فروغ دیا اور اس کے دامن میں بیش بہا موتی ٹانکے ہیں۔ان کی غزلیں عوام و خواص میں مقبول ہوئیں۔انہوں نے اردو غزل کو کمال کی وسعتیں دیں۔شہریار نے ظفر اقبال اور محمد علوی وغیرہ جیسے تجربے تو نہیں

کیے۔مثلاً:

بنا مرغے کے پر جھٹکتی ہے
مرغیاں در بدر بھٹکتی ہیں

(محمد علوی)

چر گئی ککڑی ککڑ
مکڑی تھی یا مکڑ

(ظفر اقبال)

البتہ ان کا بعض کلام فلم انڈسٹری میں پہنچا تو معیار کے سارے پیمانوں پر پورا اترا اور مقبولیت کی حدیں پار کر دیں۔ان کی یہ غزل مجرے کا گانا بن گئی۔

دل چیز کیا آپ جان لیجئے!
بس ایک بار میرا کہا مان لیجئے!

اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار
دیوار و در کو پہچان لیجئے!

خصوصیات کلام شہریار:

علائم:

شہریار کے ہاں علامتوں کا استعمال بھی بکثرت ملتا ہے. مثلا دھوپ کو علامت کے طور خوبصورتی سے برتا ہے۔شعر:

ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراثت میں ملی ہے
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

سمندر اور کشتی علامتیں:

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

سایہ بطور علامت:

ہر ایک جسم کو سایہ بھی کب میسر ہے
یہ امتیاز خدا نے مگر دیا ہے مجھے

ہوا.....علامت:

ہوا سے الجھے کبھی سایوں سے لڑے ہیں لوگ
بہت عظیم ہیں یارو بہت بڑے ہیں لوگ

سماعی پیکر تراشی:

ہر بُن مو سے درندوں کی صدا آنے لگی
کام ہی ایسا بدن میں خواہشیں بونے کا تھا

منجمد ہوتی چلی جاتی ہیں آوازیں تمام
ایک سنّاٹا ہے سارے شہر میں پھیلا ہوا

بصری پیکر:

ہر شخص مضمحل ہے بکھرنے کے خوف سے
آندھی کا قہر سرو و صنوبر پہ دیکھ کر

ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں
ان آنکھوں سے وابستہ افسانے ہزاروں ہیں

اک تم ہی نہیں تنہا الفت میں مری رسوا
اس شہر میں تم جیسے دیوانے ہزاروں ہیں

اک صرف ہمیں مے کو آنکھوں سے پلاتے ہیں
کہنے کو تو دنیا میں مے خانے ہزاروں ہیں

اس شمع فروزاں کو آندھی سے ڈراتے ہو
اس شمع فروزاں کے پروانے ہزاروں ہیں

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

شہریار کا آخری شعر جو انہوں نے بسترِ مرگ پر کہا تھا یہ ہے۔
آسماں کچھ بھی نہیں اب تیرے کرنے کے لیے
میں نے سب تیاریاں کر لی ہیں مرنے کے لیے

رفیع رضا، عہد حاضر کے اہم غزل گو شاعر اور الحادی ادب کے سرخیل

جگانے والے نے میرا کہاں خیال کیا
مَیں اپنے خواب سے آگے نکلنے والا تھا

میں سامنے سے اٹھا اور لو لرزنے لگی
چراغ مجھ سے کوئی بات کرنیوالا تھا

جوڑتا رہتا ہوں ٹوٹی ہوئی آوازوں کو
شور اتنا ہے سنائی نہیں دیتا سائیں

خانداں سے مرے حالات نہیں ملتے ہیں
خون ملتا ہے، خیالات نہیں ملتے ہیں

بتا کے ناگ کو حیران کر دیا میں نے
ہمارا زہر ہمارے دِلوں میں ہوتا ہے

میں شاخِ عمر پہ بس سوکھنے ہی والا تھا
لپٹ گیا کوئی آ کر ہرا بھرا مجھ سے

شعر کہنا بھی ضروری ہے کہ زندہ تو رہیں
سانس لینے کی بھی ہوتی ہے ضرورت سائیں
بہت دنوں کی خموشی تھی چیخ کر ٹوٹی
جو خوف تھا مرے اندر سے دھاڑ کر نکلا

رفیع رضا بی شک ملحد ہوسکتا ہے منکرِ دین اور شاتمِ رسول مقبول علیہ السلام بھی۔ یہ نہایت افسوس کا مقام ہے سمندر سے ملے پیاسے کو قطرہ مگر بطور جدید تر غزل گو، شاعر رفیع رضا کی حیثیت مسلّم ہے اور اس کی شعری عظمت کا اعتراف نہ کرنا بھی ستم ظریفی ہے اور ناانصافی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ میرا ماننا ہے کہ اگر رفیع رضا کی ملحدانہ شاعری کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور کرنا بھی چاہئے کیونکہ اس میں کوئی زیادہ دم خم ہے ہی نہیں اس کا بیشتر حصہ محض ترقی پسندوں کی نعرہ بازی ہی جیسا ہے۔ خاطر نشان رہے اردو زبان کا تعلق ہماری تہذیب سے جڑا ہوا ہے یہاں اخلاقی پھوٹ Breach ناگوار سمجھی جاتی ہے اور رہے گی بھی۔ تشکیک و انکار کی صورت میں اسلاف اور بڑے شعرا کا طرزِ عمل، برہنہ گوئی کے بجائے پر پیچ اور استعاراتی یا علامتی رہا ہے۔ مثلاً غالب کا شعر:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

''کیا کیا'' کے ابہام و استفہام نے شاعر کو برہنہ گوئی کے ارتکاب سے بچا لیا ہے۔ جہاں جہاں رفیع رضا نے یہ ٹیکنیک استعمال کی ہے وہاں اس کے اشعار تاثیر سے خالی نہیں۔ رفیع رضا کا ایک شعر۔

تری مٹی مری مٹی یہ ہماری مٹی
ایک بیکار سے بیکار کا اونچا ہونا

یہاں مٹی کے لفظ اور اسکا اونچا ہونا خوبصورت استعارہ بندی ہے ۔اس کے مقابلے میں توقیر عباس کا نیچے دیا گیا شعر روایتی مگر ہے عمدہ ہے۔

میری یہ ذات بھی مٹی، میری اوقات بھی مٹی
میں مٹی تھا، میں مٹی ہوں، مجھے مٹی ہی رہنے دو
توقیر عباس

چراغ پر رفیع رضا کا یہ شعر جس میں لو کا لرزنا عمدہ استعارہ ہے۔

میں سامنے سے اٹھا اور لو لرزنے لگی
چراغ مجھ سے کوئی بات کرنے والا تھا

نہایت خوبصورت شعر ہے۔خیال کے اختلاف کے ساتھ توقیر عباس کا" چراغ" والا شعر بھی نہایت خوبصورت ہے۔چراغوں سے دھواں اٹھنا زبردست استعارہ ہے۔

تم نے تو بچھڑنے میں ذرا دیر نہیں کی
کچھ دیر تو اٹھتا ہے چراغوں سے دھواں بھی

استعارہ وعلامت اس عصر کے لئے ایسے شعری محاسن ہیں جن میں مقابلہ آرائی (Competition) کی گنجائش نکلتی ہے اور اسکوپ ہے اور سادہ بیانی کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے۔نئے مضامین پیدا کرنا اب ہر کسی کے بس کی بات نہیں رہی. لہذا آئندہ استعارہ سازی پر ہی معیار شاعری بھی طے ہوگا۔ یہاں محض خیال آرائی سے بڑی شاعری ممکن ہی نہیں یاد رہے سب کے لئے معیار غالب ہے نہ کہ کوئی اور.....رفیع رضا کے ایک شعر پر کہیں پہلے تبصرہ کر چکا ہوں۔شعر

انسان کی ہر موت پہ مرتا ہے خدا بھی
اچھا نہیں کرتا ہے خود اپنے سے خدا بھی

توضیح:

اگر انسان کو خدا کا شہکار اور اشرف المخلوقات مانا جائے یا پھر بائبل کی کمانڈ کے مطابق created man on his imge God یا قرآنی نظریہ نفخہ روح، اقربیت (نحن اقرب الیہ...) معیت (ھو معکم...) اور احسن تقویم کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو انسان محض انسان نہیں بلکہ نور مطلق کے ظہور کا برج بلند ہے اور امانت خداوندی کا حامل خاص..... یقیناً انسان کا مرنا یعنی شہکار کی موت ایک طرح سے اس کے خالق کی نفی کی دلیل شعری ہوسکتی ہے۔ شعر کی طرفیں مزید کھولی جاسکتی ہیں. پرمغز، پرلطف اور تہہ دار شعر ہوا ہے۔

انسان کی ہر موت پہ مرتا ہے خدا بھی
اچھا نہیں کرتا ہے خود اپنے سے خدا بھی

مزید اشعار

میں نے گزارنی تھی محبت میں زندگی
میرا تو سارا وقت ہی مرنے میں لگ گیا

خطا معاف اندھیرا تو پھر اندھیرا ہے
ٹپک رہا ہے لہو آپ کے اجالوں سے

جن کو دعوی تھا شعاعوں کی پرستاری کا
ان کی دہلیز پہ سورج کو مرا پاتا ہوں

رفیع رضا عہد حاضر کا اہم غزل گو شاعر ہے، ان کی شاعری میں الفاظ کو کمال سنجیدگی سے برتا گیا ہے۔ اردو زبان و بیان صاف وشستہ ہے۔ ان کی غزلوں میں عہد حاضر کی برگشتگی اور لادینیت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ رفیع رضا کو سکہ بند مذہبی شاتم رسول کہتے ہیں وہ اپنی الحادی نکتہ نظر کے لئے معتوب و مردود جانے جاتے ہیں مگر بلا کے شاعر ہیں۔ بہرحال انہوں نے اپنے وسواس کا برملا اظہار کیا ہے اور وہ بھی غزل کی زمینوں میں۔ کیا کہنے۔ مجموعی طور پر رفیع رضا نے اردو غزل کے کھلے دامن میں مزید خوبصورت پھول ٹانک دیے ہیں۔ اور ان کی شاعری نئی اردو غزل میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

یا علی کہنے سے پہلے میں بہت مشکل میں تھا
اور مشکل بڑھ گئی ہے یا علی کہنے کے بعد

صاف وشفاف آسماں کو دیکھ کر
گندی گندی گالیاں بکتا ہوں میں

بعض اوقات نہیں ہوتا جدائی کا سبب
پھول ٹہنی کو ہلائے بنا جھڑ جاتا ہے

حضور تھوڑا ہٹیں زندگی کو رستہ دیں
ادھر سے آتی ہوئی روشنی کو رستہ دیں!

ملنے کو سارا شہر بڑا حترام سے ملا
پر جو بھی جس جگہ بھی ملا اپنے کام سے ملا

وہیں سے زہر کی شیشی بھی گھورتی ہے مجھے
دوا نکال کے کھاتا ہوں جس دراز سے میں

خمار اس کی ملاقات کا نہیں جاتا
ضرور اس میں وہ کوئی نشہ ملاتا ہے

ہوا بھی کھیلتی رہتی ہے مجھ سے
سو میں بھی ٹمٹماتا ہوں زیادہ

میں ایک بوڑھی کنواری سے مل فکر آیا ہوں
وہ کہہ رہی تھی وہ رشتے کرایا کرتی تھی

میں اگر زندہ رہا تو میں چلا جاؤں گا
میں یہاں سے کبھی مر کر نہیں جانے والا

جدید ترقی پسند شاعر: ظفر گورکھپوری

دردِ دل ہوں، کوئی اوڑھی ہوئی تہذیب نہیں
چھوڑ دوں میں جو بدن کو تو بدن مر جائے گا

میں ظفر تا زندگی بکتا رہا پردیس میں
اپنی گھر والی کو اک کنگ دلانے کے لئے

جانے والے ساتھ اپنے لے گئے اپنے چراغ
آنے والے لوگ اپنا راستہ روشن کریں

آگہی، دانش، دعا جذبہ، عقیدہ، فلسفہ
اتنی قبریں ہائے کس کس پر دیا روشن کریں

ظفر گورکھپوری درد دل اور شکوہ وشکایت کا شاعر ہیں بھلے ہی ان کی آواز سیر شکم دلدادگان غزل کو ایک آنکھ نہ بھائے لیکن پچھلے پچاس سالوں سے انہوں نے زندگی کا دکھ درد اپنے شعروں میں سمایا ہے۔ وہ اپنے ایک شعر میں یہی دعوی کرتے ہیں۔

ظفر زندہ رہوں گا میں ہمیشہ اس تعلق سے
کہ میرا عہد میری شاعری میں سانس لیتا ہے

Social taboos کی بھیڑ میں جہاں ہماری زندگی محض رسم جیسی لگتی ہے ہمارے سماج میں آدمی کا وجود آسانی سے نہیں تسلیم کیا جاتا۔ظفر گورکھپوری نے یہی رونا رویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شعریت کم ہے اور ایسی صداقتوں پر مبنی تجربات زیادہ ہیں بہر حال ظفر گورکھپوری کی شاعری میں اس کے عہد سانس لے رہا ہے. ادب تو محض تلذز کا سامان نہیں ۔ بلکہ ادب تو حیات کی تنقید بھی ہوتا ہے اور انسانی شعور کو بیدار اور اجاگر بھی کرتا ہے۔

ظفر گورکھپوری کے ساتھ " جدید ترقی پسندیت" کا ٹیگ لگایا جاتا ہے۔انہوں نے زندگی کے الم کو اپنے شعری تجربات میں پیش کیا ہے ان کے تجرباب، زندگی کا مشاہدہ ہے۔لے دے کر درد دل ہی ان کا طرہ امتیاز ہے۔اس کا اعتراف انہوں نے خود بھی ایک اور شعر میں کچھ یوں کیا ہے۔شعر:

میں اس جہاں میں ظفر مسخرے کا آنسو تھا
دکھائی کس طرح دیتا تماش بینوں کو

ظفر گورکھپوری کی کچھ سپاٹ جیسی غزلیں گائی بھی گئی ہیں مثلاً پنکج اُدھاس کی آواز میں یہ غزل۔

" اے غم زندگی کچھ تو دے مشورہ
اک طرف اُسکا گھر اک طرف میکدہ"

مزید بعض اشعار:

روشنی سر میں لئے پھرتے ہو دیوانے ہو
کسی دیوار کسی در کے حوالے کردو

تیز بارش کی دعا میں نے ظفر مانگی تھی
یہ بھی لازم ہے کہ اب گرتی ہوئی چھت دیکھوں

گھر میں پہنچوں گا تو سب گھڑی ٹٹولیں گے
آنکھ میں چبھتی ہوئی گرد ٹٹولے گا کون؟

بدن کجلا گیا تو دل کی تابانی سے نکلوں گا
میں سورج بن کے اک دن اپنی پیشانی سے نکلوں گا

ملیں گے مفت شعلوں کی قبائیں بانٹنے والے
مگر رہنے کو کاغذ کا مکاں کوئی نہیں دے گا

کلاسیکی اردو غزل کی
ایک جانی پہچانی آواز: شجاع خاور

ہم صوفیوں کا دونوں طرف سے زیاں ہوا
عرفان ذات بھی نہ ہوا رات بھی گئی

پھوٹ کر روئے بنا مسئلے حل ہو نہ سکے
سوچنے کے سبھی انداز کتابی نکلے

کچھ نہیں بولا تو مر جائے گا اندر سے شجاع
اور اگر بولا تو پھر باہر سے مارا جائے گا

یا تو جو نافہم ہیں وہ بولتے ہیں ان دنوں
یا جنہیں خاموش رہنے کی سزا معلوم ہے

شجاع خاور ہندوستان میں کلاسیکی غزل کی ایک جانی پہچانی ہوئی آواز تھے۔ میں انہیں منفرد لہجے کا شاعر نہیں کہہ سکتا کیونکہ ان کا تمام تر فن الفاظ کی نشت و برخاست یعنی سیٹینگ پر ہے ان کے یہاں استعارہ کی مثالیں بمشکل ملتی ہیں۔

جسے سب سمجھتے تھے بے بال و پر
وہی اک پرندہ قفس لے اڑا

زمیں یونہی نہیں گھومتی کسی کے گرد
مجھے بھی دوستو دن رات چلنا پڑ گیا ہے

البتہ ان کے بعض اشعار مشہور ہیں۔

تیرے بدن نے پھونک دیے فلسفے تمام
کل رات آگ میری کتابوں میں لگ گئی

تنہائی گزرنے کو گزر جائیگی لیکن
چرپائی میں ہر روز نیا بان پڑے گا

کٹ کے رہ جاؤ گے سب ہمسفروں سے تم بھی
اس لئے کوئی نئی راہ نکالا نہ کرو

نئی راہ کی بات انہوں نے ضرور کی ہے لیکن وہ اس راہ کو تراشنے میں پوری طرح کامیاب نہیں دکھائی دیتے ویسے تو انکی کتابوں پر ۱۹۷۰ تا ۲۰۱۲ کے نامور اہل قلم حضرات نے تاثرات دیے ہیں۔فراق گورکھپوری خلیق الزمان وغیرہ لیکن زیادہ تر یہ تاثرات محض شاعر کی خوشنودی کیلئے لکھے گئے ہیں حقیقت سے ان کا کوئی سروکار نہیں ۔دوسرا شجر، مصرعہ ثانی، غزل پارے، غزلیہ، واوین رشک فارسی اور اللہ ھو ان کے سب شعری مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں ۔مجموعی طور پہ کتابیں قاری کو اپنی گرفت میں نہیں لیتی اکثر اشعار میں تاثیر کی کمی ہے۔ اشعار دیکھیں۔

اڑے گا خود تو لائیگا خبر سات آسمانوں کی
اڑایا تو پرندہ چھت کے اوپر بیٹھ جائے گا

پار اُترنے کے لئے تو خیر بالکل چاہیئے
بیچ دریا ڈوبنا ہو تو اک پُل چاہیئے

اس اعتبار سے بے انتہا ضروری ہے
پکارنے کے لئے اک خدا ضروری ہے

عباس تابش کی زندہ شاعری

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

عباس تابش کا یہ شعر عوام الناس میں بہت مشہور ہوا۔لیکن جس شعر کی وجہ سے، عباس تابش کو میں جانتا ہوں وہ شعر یہ ہے۔

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

رحیم خان نے سادہ پیرایہ میں تالاب سوکھنے اور مچھلی کی بے بسی اور لاچارگی کی بات یوں کی تھی دوہا:

سر سوکھے، پنچھی اڑے، اور سرن سماہی
دین مین بن پنکھ کے، کہو رحیم کاہ جاہی

یعنی جھیلیں سوکھنے پر پرندے اڑ کر دوسری جھیلوں کی طرف چلے گئے۔ بیچاری مچھلی بن پر کے کہاں جائے؟ رحیم خان کا دوہا محض واقعاتی تاثر کا حامل ہے۔ یہاں عباس تابش نے ہنس کو، ایک سچے عاشق کا استعارہ کیا ہے۔ رحیم کا دوہا صرف حقیقت کی ترجمانی ہے جبکہ عباس تابش نے شعر کی جمالیات کو چاچاند لگا دیے ہیں ایسے ہی ایک شعر میں سورج کا استعارہ ملاحظہ کریں:

ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی
اور اس میں شام کو سورج نہایا کرتا تھا

یہاں الفاظ ہمارے گھر،جھیل، سورج اور"شام" زوال محبت کی داستان کا اشارہ/کنایہ ہے۔بعض دفعہ ابہام کی دھند شعر کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔ایک اور زبردست شعر:

وہ جس کے خوف سے چھوڑا تھا میں نے بستی کو
وہ سانپ پھر مرے سامان سے نکل آیا

یہاں سانپ خوف کا عمدہ استعارہ ہے۔عباس تابش کی شاعری میں اداسی اور غم کی خوبصورت ملی جلی کیفیت ملتی ہے۔اور اظہار اور بیان کی اپنی الگ ہی شان ہے۔اشعار پڑھتے ہی الفاظ کے پردے بادلوں کی طرح چھٹنے لگتے ہیں اور آن کی آن میں ان کے پیچھے سے معانی کا سورج ظاہر ہوجاتا ہے۔اور پھر الفاظ دودھیا بادلوں کی طرح اپنی روشن معنوی فضا میں غائب ہوجاتے ہیں۔" شاعری، بے لفظ (Wordless) محسوس ہوتی ہے"۔

A Poem should be Wordless As
the fliget of birds.

"اچھی نظم یا شعر اپنی ساخت اور رسمیت سے باہر کام کرتی ہے۔"

عباس تابش نے اہم مفاہیم کو واضح طرق پر ایسی واضح اور فصیح انداز سے پیش کیا ہے ان کے اشعار قارئین کے دل و دماغ پر زبردست اثر چھوڑتے ہیں۔صنائع و بدائع کے پرتکلف استعمال کے بجائے مقتضائے حال کے مطابق شفاف اشعار کہے ہیں،میرے خیال میں عباس تابش کی غزلوں میں غرابت اور تنافر کی شاید ہی کہیں

کوئی مثال ملے۔مجموعی طور پر ان کا کلام ضعف تالیف کے عیب سے پاک ہے تاثیر بھی خوب ہوتی ہے، ہر شعر مقتضی حال کے مطابق، در آمد معلوم ہوتا ہے۔تصنع اور تکلف کا شائبہ بھی نہیں محسوس ہوتا۔ایسی شاعری ہمارے دل و دماغ پر قوس قزح کے رنگ بکھیرتی ہے۔اس معدود موضوعات کی شاعری کو ہم خوبصورت شاعری تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسے بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے۔یہ کیا کم ہے ان کی اکثر غزلوں میں زندہ اور دھڑکتے ہوئے اشعار بکثرت مل جاتے ہیں۔

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

دھونے سے بھی جاتی نہیں اس ہاتھ کی خوشبو
ہم ہاتھ چھڑا کر بھی چھڑانے میں لگے ہیں

لگتا ہے وہی دن ہی گزارے ہیں تیرے ساتھ
وہ دن جو تجھے اپنا بنانے میں لگے ہیں

میں اس لئے تجھے آنکھوں میں بھرنا چاہتا ہوں
مجھے پتہ ہے تو لاہور آنے والا نہیں

عجیب لوگ ہیں یہ خاندان عشق کے لوگ
کہ ہوتے جاتے ہیں قتل اور کم نہیں ہوتے

جدید شعراء میں درجہ اوّل کے شاعر
پرکاش فکری (ظہیر الحق)

تاریک پربتوں میں سورج نے جان دے دی
ٹھنڈا اداس کہرا بستی پہ ڈولتا ہے

سورج پگھل کے شام کے ساحل پہ بہہ گیا
سائے سے اب یہ پوچھ کہ وہ کدھر جائے

جلے مکانوں میں بھوت بیٹھے بڑی متانت سے سوچتے ہیں
کہ جنگلوں سے نکل کے آنے کی کیا ضرورت تھی آدمی کو

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مر گئے
وہ صدا جو ڈھونڈتی تھی جنگلوں میں کھو گئی

یہ سنگِ گراں ٹوٹ کے بکھرے تو کسی روز
برسوں کی جمی برف بھی پگھلے تو کسی روز

میرے گھر کی پچھلی سیڑھی ڈوب گئی اندھیارے میں
شور مچا کر سارے پنچھی پیڑوں میں روپوش ہو گئے

پرکاش فکری جدید تر شاعروں میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔میں پہلے بھی کسی مقام پر ذکر کر چکا ہوں کہ پرکاش فکری، وہاب دانش اور صدیق مجتبیٰ تینوں معاصر اور قریبی دوست تھے۔ یاد رہے کہ پرکاش فکری کا مندرجہ ذیل شعر پس منظر رانچی میں ہوئے فسادات کی یاد تازہ کراتا ہے۔

جلے مکانوں میں بھوت بیٹھے بڑی متانت سے سوچتے ہیں
کہ جنگلوں سے نکل کے آنے کی کیا ضرورت تھی آدمی کو

مزید ایک شعر میں ان فسادات کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

مردہ پڑے تھے لوگ گھروں کی پناہ میں
دریا وفورِ غیظ سے بپھرا تھا چارسو

ان فسادات کے سب سے زیادہ اثرات .H.E.C سیکٹر میں دیکھے گئے تھے۔ فتنہ واریت ان جلے رہائشی کواٹروں کے مہاجر مکینوں کو راستے ہی نگل گئی، ان مقتول کنبوں کی یاد میں کہا گیا یہ علامتی شعر کیا امر رہے گا؟

فکری کی زیادہ تر شاعری پیکر سازی اور علامتوں پر مشتمل ہے۔غزل کے نئے رجحان سے منسلک تھے انہوں نے اپنے ہی انداز میں خوبصورت شعری تجربے کئے۔میرے خیال میں انکے الفاظ میں بانی ہی جیسی ملائمت اور تہہ داری کے نمونے بکثرت مل جاتے ہیں۔

''سفر ستارہ'' اور'' ایک ذرا سی بارش'' ان کے دو شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔کلام حیدری اور فکری'' آہنگ'' رسالہ کے مرتبین بھی رہے۔مجموعی طور پر پرکاش

فکری نہایت حساس قسم کے اور عمدہ شاعر تھے۔ منتخب اشعار اور غزلیں۔

بنتے بگڑتے پھیلتے ان دائروں کے بیچ میں
مرکز کی بس تلاش میں فکری ہے بد حواس

پنجر پڑے تھے دھوپ میں اونٹوں کے جسم کے
مدت ہوئی ہے قافلہ اس راہ سے گئے

ٹھوکر لگی تو تو پوچھ لیا سنگ کا مزاج
تاکہ اسے بھی ربط کسی نام سے رہے

بے لباسی کے سبب معتوب جو فکری ہوئے
بھیک کے کپڑے بدن سے وہ لگاتے کس طرح

نہ رکھ سکے گا کوئی دور دستِ موسم سے
کسی کو اپنے بدن کا گلاب مت دینا

جو روشنی کے جزیروں کو ڈھونڈنے نکلے
سمندروں کی سیاہی میں کھو گئے ہوں گے

ابھرے کا پہاڑوں سے چمکتا ہوا سورج
اجڑے ہوئے منظر میں کئی رنگ بھرے گا

اس مسافت میں گھنے اشجار تو آئے مگر
روک لیتا جس کا سایہ وہ شجر آیا نہیں

بس یہی اک بات فکری دکھ ہمیں دیتی رہی
نقش پانی پر بنانے کا ہنر آیا نہیں

عابد مناوری، حامدی کاشمیری
اور فاروق مضطر کی غزلیں

عابد مناوری :

اگلے پڑاؤ پر یونہی خیمے لگاؤ گے
جتنی بھی ہے سفر کی تھکن بھول جاؤ گے

کیوں مجھے سنگسار کرتے ہو
کب میں نے کہا رسول ہوں میں ؟

مسکراتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
تم نے بزدل بنا دیا ہے مجھے

وہ بھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا
جس نے یکسر جلا دیا ہے مجھے

حدِ نظر تک صحرا تھا
سر پر دھوپ بلا کی تھی

اک زمانہ تھا جب لوگ یہ کہہ کر فخر محسوس کرتے تھے کہ ہمارا کلام شب خون میں چھپا ہے لیکن شب خون میں ظفر اقبال، بانی، محمد علوی، کمار پاشی، شہریار، عرفان صدیقی اور عادل منصوری کے علاوہ کوئی بڑا نام ابھر نہ سکا۔ ہماری ریاست جموں وکشمیر سے تیسری نسل کے شعرا حامدی کاشمیری، حکیم منظور، عابد مناوری، ہمدم کاشمیری شجاع سلطان، مظفر ایرج، عابد پشاوری، محمد یاسین بیگ، فاروق مضطر، پرتپال سنگھ بیتاب، رفیق راز، فاروق نازکی اور احمد شناس وغیرہ نئے نئے شعری جزیروں میں لنگر انداز ہوئے۔ اس کوئی شبہ نہیں کہ ان شعرا کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ عابد مناوری کا اصلی نام گوری نندن سنگھ بالی تھا۔ شاعرانہ مزاج رکھتے تھے لیکن زبان کے معاملے میں عابد پشاوری سے ذرا پیچھے تھے۔ عابد مناوری ۱۹۳۷ء میں مناور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق بھمبھر میر پور (POK) سے تھا تقسیم کے بعد جموں منتقل ہوئے۔

''بہارِ غزل'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۶۱ء میں اور دوسرا شعری مجموعہ'' شمیم گل'' ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آیا اور قارئین کی خوب داد حاصل کی۔ عابد کا شعری مزاج قابلِ رشک تھا۔ جموں وکشمیر میں کچھ شعرا شب خونی شاعری کرتے رہے مگر عام لوگوں میں کوئی شناخت قائم نہ کر سکے۔ ویسے بھی شب خون ہو یا تفہیم تقریباً بیس کروڑ اردو جاننے والوں میں سے کتنے لوگ پڑھتے ہوں گے؟ لہٰذا رسالوں کو اعلیٰ معیار دینے سے عام لوگ ان سے کٹ جاتے ہیں کیونکہ عوام الناس تک ان کی رسائی نہیں ہے اور یوں بھی عوام کی عادت سہل پسندی ہے نہ کہ مشکل پسندی۔ عابد مناوری کہتے ہیں کہ :

جب آسمان پر مہ و اختر پلٹ کر آئے
ہم رخ پہ دن کی دھوپ لئے گھر پلٹ آئے

عابد مناوری کی ایک غزل :

یوں خیال آتا ہے اس کا ، یاد آئے جس طرح
گرمیوں کی دوپہر میں شام کی ٹھنڈی ہوا

اور ابھی ہم سلگیں گے کمرے کے آتش دان میں
اور ابھی کہسار سے اترے گی برفیلی ہوا

ہم بھی اک جھونکے سے لطف اندوز ہو لیتے کبھی
بھولے بھٹکے سے اس گلی میں بھی چلی آتی ہوا

اس نے لکھ بھیجا ہے یہ پیپل کے پتے پر مجھے
کیا تجھے راس آگئی بجلی کے پنکھے کی ہوا

اس مندرجہ ذیل شعر کا جواب نہیں ۔

کیونکر اے عابدؔ بجھا پاتا میں اپنی تشنگی
مجھ تک آنے ہی سے پہلے ہوگیا پانی ہوا

پانی کا ہوا ہونا کمال کی جدت طرازی ہے ۔ عاشقی ۔ ''کیا حقیقی ، کیا مجازی'' عابد مناوری ہر دو روایت کا پاسبان تھا اور ترجمان بھی ۔

انہوں نے سماج کا گہرا مطالعہ کیا اور اسے اپنے تجربات شاعری کی صورت میں ہمارے سامنے رکھا ۔ یہاں سماج کہو یا مذہب یا سیاسی نظام ۔ انہوں نے ایک شعر میں کشتی کی علامت برتی ہے اور بڑی مہارت سے ۔ وہ کہتے ہیں کہ :

چھید ہی چھید ہیں فقط جس میں
ایسی کشتی کا بادباں ہوں میں

یاں گراں گوش ہے نگر کا نگر
یا کسی دشت میں اذاں ہوں میں

حامدی کاشمیری :

نادیدہ ساحلوں کے چراغوں کو گل کرو
ہم کالے پانیوں میں گرفتار ہو گئے

حامدی کاشمیری برگزیدہ ناقد اور ادبی نظریہ ساز بھی ہیں ۔تنقیدی اور افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کے شعری تجربات پانچ مجموعوں پر مشتمل ہیں ۔ایسے لوگ اپنے زمانہ سے پہلے علمی افق پر نمودار ہو جاتے ہیں ۔لہٰذا ان کے معاصر انہیں سمجھ نہیں سکتے ۔ حامدی کی فکری بالیدگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اکیسویں صدی کے انسان ہیں اور مدبرات اجل کی فروگزاشت یا بھول چوک سے بیسویں صدی میں پیدا ہو گئے ۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات ان کے دور کے لوگوں کی ذہنی سطح سے کچھ مافوق ہیں ۔حامدی اس صدی میں ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے تو کیا ہوا؟

میر جیسا فخر روز گار،غالب اور جان کیٹیس جیسے جینیس شاعر بھی اپنے اپنے دور میں یہ سبھی غریب شہر بن کر رہے ۔عوام وخواص کا ناشناسانہ رویہ حامدی کے ساتھ نیا نہیں ، بہر حال اس معاملہ میں وہ شاکی ہی رہے اور ان کی شکایت حق بجانب ہے ۔

شاعری ہو یا تنقید انہوں نے نئے تجربے کئے اور نیا تنقیدی نظریہ دیا.....س کی سرحدیں انکشاف و الہام سے جوڑی گئی ہیں ۔اگر شعر الہامات کا سلسلہ ہے تو اس کی ترسیل اور قرأت بھی انسانی دماغ کو عہد بہ عہد نئے نئے الہامات سے ہمکنار کرتی

رہے گی۔

شاعری کیا ہے اور اسے کیسے سمجھا جاسکتا ہے اس کی تعین ِقدر کون کرسکتا ہے؟ چلو ان سوالوں کا جواب ہم حامدی سے لیتے ہیں ۔ حامدی کاشمیری کی تنقیدیات ۲۲ تصانیف پر مشتمل ہے ۔وہ افسانے بھی لکھتے ہیں اور شاعری بھی خوب کرتے ہیں ۔تنقید کے حوالے سے ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' ان کی آخری کتاب ہے اور یہ ان کے نظریات کو سمجھنے کے لئے مکمل رہنما ہے ۔'' کارگہہ شیشہ گری''میر کے مطالعہ پر زبردست تنقیدی کتاب ہے اس کے ابتدائی باب دریائے سخن میں حامدی کاشمیری شاعری اور نقاد کی اہمیت ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں :

> ''شاعری بنیادی طور پر ایک طلسم کارانہ تخلیقی فن ہے ۔شاعر لفظ و پیکر کے علامتی برتاؤ سے تجربات کے طلسم کدوں تک عام قاری کی رسائی ممکن نہیں ۔اس لئے ایک صاحب نظر نقاد کی رہنمائی ناگزیر بن جاتی ہے ۔ چنانچہ نقاد اپنی نازک حسیت بصیرت لسانی شعور اور گہرے ادراک سے کام لے کر ان طلسم کدوں کے جادوئی دروازوں کو وا کرکے اسراری جلوؤں کی شناخت کرتا ہے ۔ اور انہیں قاری پر ارزاں کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے، چنانچہ ان جلوؤں کو دیکھنا اور دکھانا اس کے فرائض منصبی میں شامل ہوجاتا ہے ۔''

اس سلسلہ میں وہ ''شش استدلالی نکات'' پیش کرتے ہیں ، دراصل پہلے تین نکات پس ساختیات اور رد تشکیل ہی کے زمرہ میں آتے ہیں ۔میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان کا اعادہ ہیں یا تکرار ۔ باقی تین نکات جو حامدی پیش کرتے ہیں ان کی اکتشافی تنقید کا

لب لباب ہیں ان کے نظریہ کے یہ سہ استدلاتی نکات اہم ہو سکتے ہیں :

(۱) متن کی لسانی صورت گری کا تجزیہ۔

(۲) تجربے کی بازیافت وتفہیم۔

(۳) قدرِ سخنی

اگر ان کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں ہم ان کی کتاب کا تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ (عروس تمنا) فقط بیانیہ / عامیانہ شاعری پر مشتمل ہے۔ البتہ کہیں کہیں کوئی ایسا شعر مل جاتا ہے جو ان کے آئندہ سالوں کے پختہ فن کا پیش خیمہ محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً :

تو کھو نہ جائے کہیں تھک کے منزلِ شب
تری تلاش میں خود ہی سحر نکل آئی

گھر سے باہر قدم کہاں رکھیں
ہے عجب دارو گیر راہوں میں

سوکھی جاتی ہیں جھیلیں ساری
یہ کوئی مسئلۂ ذات نہ تھا

واقعی بڑے آدمی اپنی ذات کے علاوہ آفاق کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ ان کا وجود انسانوں کے لئے ہی نہیں طیور و وحوش بلکہ پورے ماحول کے لئے میٹھے پانی کی جھیل جیسا ہوتا ہے۔

میں شاید اس کا سراغ پاؤں
ہر ایک تحریرِ سنگ دیکھوں

تحریر ِسنگ سے مراد کتبہ ہے، ضروری نہیں کہ آدمی کو ہم اس کے جیتے جی پہچان سکیں۔ یہ زبردست استعارہ ہے۔ یہاں معنی کا نیا باب کھلتا ہے کہ انسان کو سمجھنے کا عمل اس کی موت سے نہیں رکتا بلکہ بعد میں جاری و ساری رہتا ہے۔ ان کی شاعری کے اصلی جوہر ان کے چھٹے اور ساتویں شعری مجموعے میں اوج پر ہے۔ علی الترتیب ان کے نام یہ ہیں۔ خواب ِرواں اور شہر ِگماں۔ حامدی کی شاعری کی پذیرائی نہ ہونے کے وجوہات یہی قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں کہ اس کا انہیں خود بھی اندازہ تھا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہر نئے دور میں نقاد معاصر شعرا کا معروضی اور احتسابی مطالعہ کرنے سے اس لئے اجتناب کرتے ہیں کہ کہیں تعلقات عامہ یا شخصی عافیت معرض خطر میں نہ پڑ جائے، بعض صورتوں میں معاصرانہ چشمک تعصب یا کمرشل مفاد کی بنا پر ان سے اغماض برتا جاتا ہے۔ تنقیدی طریق کار کی رسمیت کا گھسا پٹا (Stereotyped) اس کا سبب ہوسکتا ہے۔ حامدی کاشمیری کی شاعری کی قدردانی اور ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنا باقی ہے۔ وہ بلند پایہ نقاد بصیرت رکھنے والے شاعر اور فکشن نگار بھی ہیں۔

تہہ آب میری بصارت گئی
ہتھیلی پہ لعل و گہر آگئے

بال کھولے عورتوں میں ڈھل گئے
راہ میں ایسے شجر دیکھے نہ تھے

کوئی تدبیر کر لو چارہ سازو
بس اک دو پل کی مہلت رہ گئی ہے

بات یہ آبلہ پایاں کیا ہے ؟
دشتِ تیرہ میں چراغاں کیا ہے ؟

کون تاریک عذابوں میں نہ تھا
حرف رخشندہ کتابوں میں نہ تھا

فاروق مضطر:

کب سے دوہرا رہا ہوں میں مضطر
ایک فہرست چند ناموں کی

یہ سر ِ راہ قطار پیڑوں کی
اور پھیلے گا آگ کا دریا

خدا کے نام جھوٹ سچ کے سلسلے
خدا بہت ہے نامدار شہر میں

مچھلیاں خود فریب ہوتی ہیں
اک مچھیرے نے تبصرہ لکھا

خود سے روشناس ابھی تک نہ ہوسکا
یہ اتفاق ہے کہ جو تم سے ملا ہوں میں

مثال ِ برق گری ایک آن تیغ ِ ہوا
ابھی دریچوں سے لوگوں نے سر نکالے تھے

فاروق مضطر نے شاعری ،تنقید اور فکشن کے علاوہ تھنہ منڈی (ضلع راجوری) سے معیاری اردو ادبی جریدہ ''دھنک'' کی ادارت بھی کی ۔''دھنک'' ریاست جموں وکشمیر کا واحد ایسا پرچہ تھا جس کو ''شب خون'' کے برابر دیکھا جاتا تھا۔اس کے علاوہ محمد ایوب شبنم (مؤلف ادبیات ِ پونچھ) جن کا تعلق ضلع پونچھ تحصیل سرنکورٹ سے ہے،ان کے ساتھ مل کر''ستاروں سے آگے'' ادبی وسیاسی مجلہ بھی نکلا تھا۔دیگر بہت سے اخبارات کی ذمہ داری بھی بخوبی سے نبھائی ۔لیکن مضطر صاحب کا ''دھنک''،مکمل طور پر معیاری ادبی جریدہ تھا اور جموں وکشمیر کا پہلا جدید طرز کا رسالہ تھا۔

فاروق مضطر کی شاعری کی پرواز بلند تھی ۔وہ خطۂ پیر پنجال کے پہلے جدید شاعر ہیں ۔وہ ظفر اقبال اور بانی سے بہت متاثر تھے۔ہماری ریاست میں پرتپال سنگھ بیتاب ، رفیق راز جیسے قد آور شعرا ان کے معاصر ہیں ۔جدید اردو شاعری میں ان کے پیشتر اور معاصر شعرا بانی ،عادل منصوری ،فرحت احساس ،آشفتہ چنگیزی ،صلاح الدین درویش جیسے معتبر اسمائے گرامی ہیں ۔

مضطر کی شاعری میں کئی انواع کے بصری سمعی/ پیکر وغیرہ ملتے ہیں ۔ان کے بعض اشعار پڑھ کر''ہوا میں رنگ اور خوشبو میں لہر'' دکھائی دینے لگتی ہے ۔ان شعری دھندلکوں کے دیکھنے اور محسوس کرنے سے باذوق قاری کو کیف و سرور ملتا ہے ۔ مضطر صاحب کے چند اشعار :

میں بولتا رہا تو کسی نے نہیں سنا
میں چپ ہوا تو سارا شہر گونجنے لگا

دیکھو میری جبیں پہ میرے عہد کے نقوش
رکھو مجھے سنبھال کے اک آئینہ ہوں میں

جانے کیوں ڈوبتا رہتا ہوں میں اپنے اندر؟
جانے کیوں سوجھتی رہتی ہیں الٹی باتیں ؟

ان کے بعض اشعار میں ابہام بھی پایا جاتا ہے ۔تاہم پس ِساختیات Post Structuralism اور ساخت شکن یا رد تشکیل Deconstruction کے اصولوں کے مطابق اس قسم کی مبہم شاعری کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے ۔اس طرح شاعر کی شاعری اس کی ذات سے کاٹ کر یا الگ کر کے دیکھی جاتی ہے اور متن سے قاری اپنے ذوق کے مطابق لطف حاصل کرتا ہے اور کچھ حظ بھی پالیتا ہے ۔فاروق مضطر کا ایک شعر :

ایک دن ساری کتابوں کو لپک جائے گی آگ
اور پھر اس راکھ سے اک حرف لکھا جائے گا

بائبل میں لکھا ہے :

In the begining was Word,and
the Word was with God, and the
Word was God

مذکورہ بالا شعر میں بائبل کی Command کو نہایت خوبصورتی اور چابک دستی سے سمو دیا گیا ہے ۔اختصاری روح ِاعجاز ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ شعر، با اعتبار ِ کفایت لفظی، نادر ہے ۔

سیفؔ انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

فاروق مضطر نے کیا خوب کہا ہے کہ :

شاہراہوں سے گریزاں ہے مگر کچھ سوچ کر
عادتاً پہلے تو وہ پگڈنڈیاں چلتا نہ تھا

پتہ نہیں کیوں کس دوسری مصلحت کے پیشِ نظر ہمارے اس اہم شاعر نے شاعری کو خیر آباد کہہ دیا۔ ان کے کلام کی کمیت کے باوجود اس میں برجستہ وموزوں اشعار مل جاتے ہیں۔ جدت اور تازگی کے باعث امید کی جاتی ہے کہ یہ شاعری دیر تک زندہ رہے گی۔ مضطر صاحب کی قنوطیت مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہے :

مگر ان آنکھوں میں کس صبح کے اجالے تھے؟
ہمارے نام کے سارے حروف کالے تھے

ہم بھی پگھلیں گے، سائے بھی نہ ٹھہریں گے
جانے کب یہ سبز منظر بھی ہوا ہو جائے گا

پیڑ اگلیں گے سیاہی کا سمندر
موسمِ خوش رنگ زخم پا ہو جائے گا

ہوا کے ساتھ کہاں تک اڑان بھرتا ہوں
حدودِ جسم میں اک پر کٹا پرندہ ہوں

فصیلِ جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

فاروق مضطر صاحب کا یہ خوبصورت شعر دیکھئے :

چہار سمت گھرا ہوں میں پانیوں میں یہاں
مرا یہ کرب کہ اک ڈوبتا جزیرہ ہوں

پانیوں میں گھرنا، ڈوبتا جزیرہ ۔شعر تو بہت اچھا اور منفرد ہے، یہ تراکیب ظفر اقبال اور فاروق مضطر نے بہت اچھے سے استعمال کی ہے۔ ظفر اقبال کا شعر:

میں ڈوبتا جزیرہ موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

فاروق مضطر نے کُل تیس چالیس غزلیں اور نظمیں کہی ہوگئیں (انہیں شاعری چھوڑے لگ بھگ چالیس سال ہوگئے) مگر اب بھی ضلع راجوری میں اس معیار کی شاعری کوئی نہیں کر سکا۔مضطر خطۂ پیر پنجال کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام شب خون، الفاظ، سوغات، آجکل اور تناظر وغیرہ جیسے اعلیٰ معیاری رسائل میں شائع ہوا۔کئی وجوہات کی بنا پر انہیں اپنا شعری سفر چھوڑنا پڑا۔

عہد حاضر کے نمائندہ غزل گو شاعر: عرفان ستار

تابِ یک لحظہ کہاں حسنِ جنوں خیز کے پیش!
سانس لینے سے توجہ میں خلل پڑتا ہے

وہ اک روزن قفس کا جس میں کرنیں ناچتی تھیں
مری نظریں اسی پر تھیں رِہا ہوتے ہوئے بھی

غزل کی صنف جلدی جلدی گرفت میں آنے والی نہیں بلکہ یہ اپنے چاہنے اور کہنے والے سے کڑی ریاضت کا مطالبہ کرتی ہے۔غزل کے سنہری دور کے شاعر حسرت موہانی نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

جسے ہم خوبصورت سے خوبصورت غزل کہتے ہیں ،جس کی داد دیتے وقت تعریفوں کے ڈونگرے برساتے ہیں۔اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں دراصل کم وبیش ہر شاعر کی شعر سازی کا یہ کاروبار مصنوعی ہوتا ہے اسکی کچھ وجوہات ہیں :۔

غزل کا تعلق براہ راست مجمع قارئین سے ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر قصیدہ کے تشبیب سے نکلی ہے۔اسی لئے یہ سریع الاثر اشعار اور عامیانہ طرز کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہی

وجہہ ہے کہ مشاعروں میں عام سے عام شاعروں اور متشاعروں کو داد مل جاتی ہے۔ بعض بڑے شاعروں کو لوگ حیرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

دوسری وجہہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔اگر چہ ردیف و قافیہ اس کے صوتی جمالی اور بندش کے معاملوں میں guide stone کا کام کرتے ہیں۔لیکن یہی ردیف و قافیہ اسکو محدود بھی کرتے ہیں۔یہ غزل کی خامی ہے مزید ایک بڑی وجہہ اس صنف میں تصنع کی یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اکثر اشعار شاعری کی عادت کی وجہہ سے سرزد ہوتے ہیں۔اکثر شعرا چبھائے ہوئے نوالے ہی چبھاتے رہتے ہیں۔اسی کارن بالعموم غزلوں میں خیال کی یکسانیت پائی جاتی ہے.بقول شخصے:''لہذا یہ یقین سے نہیں جاسکتا کہا جاسکتا ہے کوئی ایک شعر مخصوص شاعر کا خالصاً اپنا ہے''بلکہ اگر تحقیق کی جائے اور پر وسیع المطالعہ شخص سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ غزل کے بیشتر اشعار کسی نہ کسی صورت میں کئی بار پہلے بھی کہے جاچکے ہیں۔

سیف انداز بیان رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

بلکہ بعض دفعہ غزل کا شاعر خود بھی بے خبری یا عادت سے مجبور ہو کر بار بار ایک ہی خیال کو بار بار دہرائے جاتا ہے مثلاً میر کے دواوین کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے میر کے موضوعات بالکل معدود ہیں لیکن انکے اندر معمولی ردو بدل سے میر نے مصنوعی تنوع پیدا کیا ہے۔جو انہیں جاذب بنا گیا ہے۔قابل قبول اس بدیع الاسلوبی ہی نے انکی بعض شاعری کو زندہ رہنے کے قابل بنایا ہے لیکن ہے تو وہ بھی کاریگری۔

شمس الرحمٰن فاروقی،میر کو غالب سے بڑا شاعر ثابت کرنے چلے تھے اور کئی سالوں کی ریاضت کے بعد''شعر شور انگیز'' لکھی۔لیکن اس کتاب میں میر تقی کے اشعار کے

وہ وہ مطالب نکالے جو میر نے غالباً کہے ہی نہیں تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کتاب میں فقط گنتی کے اشعار پر بحث ہے اور کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ گویا میر کی داڑھی سے، فاروقی نے انکی مونچھیں بڑھادی ہیں۔ بقول محسن

''ذرا سی بات پہ محسن بھگو لیتے ہو تم آنکھیں''

بہر کیف اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا ہوں۔ شعراء مصرع اولی کہنے کے بعد مصرع ثانی میں نفسیاتی الجھن کی بنا پر لفظوں کا Cross puzzle یعنی کراس پہیلی بناتے چلے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ نفسیاتی پیچیدگی وقتی لطف دیتی ہے۔ شاعر ہمیں بے وقوف بنا کے چلا جاتا ہے۔ کئی دفعہ کوئی قلم توڑ شعر بھی ہو جاتا ہے۔ آمدم بر سر مطلب۔ دیکھنا یہ ہے کہ عرفان ستار، غزل پر کئے گئے اعتراضات سے دامن چھڑانے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں، کیا انہوں نے اپنی شاعری کو نئی حسیت سے فروزاں کیا ہے یا نہیں، کیا انہوں نے رسمی حرف کوشی و روایتی تکتب سے نجات پائی یا نہیں، کیا انہوں نے غزل کا معیار مشاعرے کی سطح سے بلند کیا یا نہیں، کیا انہوں نے محض لفظوں کی پہیلیاں بنائی ہیں اور فقط سوختانہ اور گلے سڑے کہے ہیں؟

ان سبھی سوالوں کا جواب ایک ہی جملہ میں دونگا وہ یہ عرفان ستار کی شاعری کلاسیکیت اور جدید حسیت کا خوبصورت آمیزہ ہے۔ جس میں ہر طرح اشعار موجود ہیں۔ مزید انہوں نے کلاسیک کو نہ چھوڑتے ہوئے پرانے عروضی سانچوں میں نئے ڈھنگ سے لفظ گری کر کے خوبصورت مثالیں قائم کی ہیں۔ غزل تو ہے ہی لفظوں کاریگری اور ریزہ خیالی۔ وہ اس عہد کے بہترین کاریگروں اور معماروں میں سے میں سے ہیں۔ انکی غزل کی شاعری میں مٹی کی محبت دنیا کی بے ثباتی ہجر و فراق، انتظار و شوق دیدار، کرب آگہی، دنیا سے بیزاری، لذت وصل اور ثمر چیدنی ضمیر زندہ، روح

زبان اور آرزومندی وغیرہ موضوعات کی مثالیں کم نہیں۔ مٹی کی محبت یا حب الوطنی پر ایک شعر:

میں اپنی مٹی سے اپنے لوگوں سے کٹ گیا ہوں
یقینا اس سے بڑا کوئی سانحہ نہیں ہے

ابھی اے بادِ وحشت اس طرف کا رخ نہ کرنا
یہاں مجھ کو بکھرنے سے بچایا جا رہا ہے

پوچھتا ہے یہ ہر اک خار سرِ دشتِ طلب
آنے والا بھی کوئی آبلہ پا ہے کہ نہیں

میں سمجھا تھا سیئے گی آگہی چاکِ جنوں کو
مگر یہ زخم تو پہلے سے گہرا ہو گیا ہے

چلا جاتا ہوں دل کی سمت بھی گاہے بہ گاہے
میں ان آسائشوں میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی

وہ ایک پل ہی سہی جس میں تم میسّر ہو
اُس ایک پل سے زیادہ تو زندگی بھی نہیں

ہزار تلخ مراسم سہی پہ ہجر کی بات
اُسے پسند نہ تھی اور ہم نے کی بھی نہیں

جو یہ نہ ہو تو سخن کا کوئی جواز نہیں
ضمیر زندہ رہے تو زباں بھی زندہ رہے

کسے خبر کہ تہِ خاک آگ زندہ ہو
ذرا سی دیر ٹھہر ، اور دیکھ بھال مجھے

ابھی ہوئی ہے پلک سے پلک ذرا مانوس
ابھی نہ جا مجھے اس خواب سے رہا کر کے

الغرض انکے دو شعری مجموعہ ''ساعتِ امکاں'' اور ''تکرار ساعت'' اور ''یہ عشق ہے'' میری نظر سے گزرے ہیں۔ان میں بیش بہا گوہر موجود ہیں۔مزید کچھ اشعار:

تیرے لہجے میں ترا جہل دروں بولتا ہے
بات کرنا نہیں آتی ہے تو کیوں بولتا ہے؟

یہ کیسے ملبے کے نیچے دبا دیا گیا ہوں
مجھے بدن سے نکالو میں تنگ آ گیا ہوں

میں تو وارفتگی شوق میں جاتا ہوں اُدھر
نہیں معلوم وہ آغوش بھی وا ہے کہ نہیں

کسے دماغ ہے بے فیض صحبتوں کا میاں
خبر اڑا دو کہ میں شہر سے چلا گیا ہوں

افضال نوید: کریفٹ کے شاعر

نئی غزل میں کریفٹ اور وزن تو ضروری ہیں ہی اسکے علاوہ استعارہ کی تازگی، کفایت لفظی یعنی گوتھی ہوئی شعری بنت جس سے تہ در تہ معانی کی پرتیں برآمد ہونا از حد ضروری ہے ۔" غزل کا آرٹ واقعیت کا نہیں واقعیت کی تقلیب خیال بافی اور ایمائیت کا آرٹ ہے"۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست:
بسیار شیوہ ہست بتاں را کہ نام نیست

افضال نوید زود گو شاعر ہیں ان کے یہاں جتنا زور شعری کریفٹ پر ہے اتنا معنوی تہ داری پر نہیں۔ زیادہ تر اشعار بٹی ہوئی رسی کی طرح پیچدار نہیں بلکہ ڈھیلے ڈھالے پیکر ہیں۔ انکے یہاں زیادہ تر لفظ و معنی انمول نہیں ہوسکے ہیں اور نہ ہی مرکزی خیال، شعری فضا کے افق پر پوری آب و تاب سے طلوع ہوسکا ہے اس طرح انکے یہاں بسا وقات معانی لفظوں کی بھیڑ میں گم ہوجاتے ہیں ۔لہٰذا زیادہ تر اشعار جیسا کہ میری نظر سے گزرے ہیں برجستگی کے بجائے آشفتگی کا شکار ہیں۔اس کی وجہ انکی مزاج کا انتشار Turbulance ہے و اشعار میں در آیا ہے۔ یہ انتشار شعر کہنے کے لئے محرک ہوتا ہے مگر عمدہ شعر گوئی، تنظیف اور سینڈ ویچنگ کے عمل ہی جیسا

ہے۔کہا بھی گیا ہے کہ شعر تو حکمت میں سے ہے۔میرے خیال میں یہ منزل ہر شاعر کا مقدر نہیں ہوتی۔جوش کی طرح انہوں نے Dull شاعری کی ہے۔

ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

نیچے دیے گئے اشعار کی قرات سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے شعر میں "آواز" کو لہر کہا ہے لیکن یہاں یہ لفظ "آواز" الفاظ میں باہمی ربط اور تنظیم کاری کی کمی کی وجہ سے، شعری فضا پر پوری طرح چھا نہیں سکا لہذا شعر بلند نہیں ہو سکا۔

دوسرا شعر بہتر ہے "بادِ نوخیز" کا ٹھہرنا اشارہ ہے صنوبر سے متصادم ہونے کا، لہذا شعر میں ہمنوا خنگی کی فضا قائم ہوئی ہے۔تیسرے شعر میں "برسات" سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور نہایت موزوں ہے لہذا شعر میں تہ داری آ گئی ہے۔تینوں اشعار الگ الگ مراتب اور درجہ کے ہیں کلام میں ہمواری کی منزل ابھی ذرا آگے کی بات ہے۔افضال نوید کے اشعار دیکھیں:

تیری آواز اترتی ہے کسی ساحل پر
بھیگ جاتا ہے کسی لہر سے پتھر میرا

بادِ نوخیز ٹھہرتی ہے گزر جاتی ہے
اپنے ہی دھیان میں رہتا ہے صنوبر میرا

جانتا ہوں کہ کسی شہر میں برسات ہُوئی
لوٹ کر آیا نہیں چھت پہ کبوتر میرا

راہ اک اور پس راہ نکل آتی ہے
کام کچھ اور بگڑ جاتا ہے بن کر میرا

مَیں اپنے آپ کو باہَر سے دیکھنے لگا تھا
اسی لیے مجھے اندر کے کام بھول گئے

ہم اس کو دیکھتے رہنے میں ہو گئے مصروف
اور ایسا کرنے میں کرنا سلام بھول گئے

لمحے سے برسوں کا پیچھا کب نکالا مَیں نے
عمر بڑھ جانے سے بھاری کہاں زنبیل ہُوئی

نعمان شوق، محمد اظہار الحق اور عمار اقبال کی شاعری

نعمان شوق

اونچی بولی لگائیے صاحب
خون میں ڈوبی آستیں ہوں میں

کبوتروں میں یہ دہشت کہاں سے در آئی
کہ مسجدوں سے بہت دور جا کے بیٹھ گئے

اصطلاحیں رٹ کے ناقد ہو گئے
ناف دیکھی اور والد ہو گئے

وہ زہر آلود طنز کے تیر جب پھینکتے ہیں بیچ میں مسخرا پن بھی آجاتا ہے شعر:

جانے کیا بیتے گی حوروں پر وہاں
سارے دور اندیش زاہد ہو گئے

نعمان شوق نے تیمم، جنت حور، زاہد کاسہ، دستار۔ مومنین جیسے الفاظ کو برتا ہے ان کی شاعری ایک طنز خفیف سے آگے نہیں بڑھ سکی اور ایک فریب خوردہ سماج سے ڈرتے ڈرتے اشاروں میں باتیں کرتے ہیں وہی ان کا طرہ امتیاز ہے۔

وہ سماج میں پائی جانے والی خرابیوں یا ان کی بنیادی عمل "Root Causes" کی نشان دہی کرتے ہیں اور اشارہ کرتے ہیں۔

ان اشعار میں کوئی گہرائی نہیں البتہ جا بجا اکبر کے طرز پر طنز کے نشتر چلائے جاتے ہیں۔ البتہ بعض غزلیں معیاری ہیں اور ان کی اصالت کا قائل ہوں۔

عادتاً مسکرا کے ملتا ہوں
فطرتاً سازشی نہیں ہوں میں

محمد اظہار الحق

تم اپنے اقلیم سے زر و سیم جمع کر لو
میں اپنی گدڑی سے ایک آیت نکالتا ہوں

سفید ریشم کی اوڑھنی میرے ہاتھ میں تھی
مگر اسے داغ دار میں نے نہیں کیا تھا

میں اپنے جسم کو اس خواب پر قربان کر دوں
میں تیرے شہر کے رستوں کی مٹی ہو گیا ہوں

محمد اظہار الحق نرم لہجے اور الفاظ میں امرت رس بھرنے والے معمر اور تجربہ کار شاعر ہیں۔ جب شعر کہتے ہیں تو وہ قارئین کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ وہ اس دنیا کی سعادت کو استعاراتی انداز میں کچھ یوں ذکر کرتے ہیں:

کوئی عزت نہیں ان چیتھڑوں میں
مجھے دے کر وفورِ غیب کے ہاتھ

مقید ہوں میں کالی کوٹھڑی میں
مہیا کر ثمر اے غیب کے ہاتھ

محمد اظہار الحق نے یہ شعر شاید امیر خسرو سے متاثر ہو کر کہا ہے۔ شعر

اندھیری شام تھی بادل برس نہ پائے تھے
وہ میرے پاس نہ تھا اور میں کھل کے رویا تھا

اب امیر خسرو کا شہرہ آفاق شعر دیکھیں:

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چون کنم دل بے چنین روز ز دلدار جدا

ابر و باران و من و یار ستادہ بہ وداع
من جدا گریہ کنان، ابر جدا، یار جدا

ظاہر ہے خسرو کا خیال تو مستعار لیا جا سکتا ہے لیکن زبان کی وہ لوچ کو شاید ذرا آگے کی بات ہے۔ ان کی شاعری کلاسیک اور جدید کا امتزاج کہی جا سکتی ہے لیکن روایت زدگی کا عنصر جدت پسندی پر حاوی ہے۔ ایک غزل کے اشعار:

کیا رات تھی بدلے گئے جب نام ہمارے
پھر صبح کو خیمے تھے نہ خدام ہمارے

اے ارضِ سیہ روز! کوئی اور ہی سورج
شاید کہ بدل جائیں یہ ایام ہمارے

مٹی کی محبت میں کہتے ہیں:

اسی مٹی سے زیتون کے باغ اگائیں گے
یہی غرناطہ یہی سسلی ہے جیسی بھی ہے

دنیا کی بے ثباتی محمد اظہار الحق کے ہاں نئے رنگ سے ظاہر ہوتی ہے:

یہاں فرقِ مراتب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
مگر یہ بھی تو اے دنیائے فانی جل اٹھے گا

عمار اقبال

عمار اقبال خواص کے شاعر ہونے کے ساتھ عوام الناس کے شاعر بھی ہیں بقول شخصے سیدھے سادہ الفاظ میں گہری باتوں سے دلوں میں گھر کر جانے والا یہ شخص میرے بھی دل میں گھر کر گیا ہے ''بعض دفعہ شعرا بے گھر ہوتے ہیں انکے پاس دنیوی مال و اسباب کم ہی ہوتا ہے لیکن یہ لوگوں کے دلوں میں بستے ہیں ۔عمار اقبال کی شاعری میں استعارے شاید زیادہ نہیں ملیں گے... وہی اکہری پرت والی شاعری ہے سریع الاثر ہونے کی وجہہ سے شاعری عوام الناس کو اس قسم کی پسند ہوتی ہے ۔میر کے سہل ممتنع اشعار آج بھی زندہ ہیں ناصر کاظمی کی سادگی اور پیکر سازی میرے خیال میں صدیوں تک زندہ رہے گی ۔عمار اقبال کی شاعری میں گہرائی پیدا کرنا باقی ہے۔

ہم درختوں کو کہاں آتا ہے ہجرت کرنا
تم پرندے ہو چمن چھوڑ کے جا سکتے ہو

''ہو''لفظ کو بہتر انداز میں استعمال کیا ہے ۔شاعری کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ یہ ''بہترین الفاظ کو بہترین ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ہے'' تا کہ تاثر بڑھ جائے۔

وزن ردیف قافیہ شعر کے زیورات ہیں اور تخیل یا بنیادی خیال شعر کا جثہ ہے جب جثہ ہی نہ ہو تو زیورات کسی شوروم کی "ڈمی" پر ٹنگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔عمار اقبال کی شاعری اس عیب سے پاک ہے۔

مجھ کو اس لفظ کا مطلب نہیں معلوم
آپ کی ''ہوں'' نے مجھے سوچ میں ڈالا ہوا ہے

سن اور ان سنی پر ایک شعر کس قدر عام فہم اور سادہ الفاظ کا مرقع ہے۔

سنو اور سن کر ان سنی کر دو
میں صدا بار بار دوں؟ اچھا

یہ رنگ سخن عمار اقبال کا شاعر یونہی نہیں مشہور ہوتے ہر عہد میں دنیا میں ذکی الحس لوگ موجود رہتے ہیں جو جعلی اور اصلی شعر کی پرکھ آسانی سے کر لیتے ہیں۔دو شعر دیکھیں.

میں رنگ بھرتا ہوں اس میں وہ جان بھرتا ہے
ورق سے کوئی پرندہ اڑان بھرتا ہے

تھک گئے ہو تو تھکن چھوڑ کے جا سکتے ہو
تم مجھے واقعتاً چھوڑ کے جا سکتے ہو

کمار پاشی، عادل منصوری، سلیم احمد اور محمد علوی کی غزل

کمار پاشی کا نام جدید رجحان ساز شعرا میں سر فہرست ہے۔ انہوں نے لفظ کو نئے ڈھنگ سے استعمال کیا ہے... اشعار:

خود میں دھنسا جا رہا ہوں دم بہ دم
میرے شانوں پر یہ بیٹھا کون ہے؟

صبح تارے چنتا ہوں بستر سے میں
رات میرے گھر میں آتا کون ہے

آگے بڑھنے ہی نہیں دیتا مجھے
میرے پیروں سے یہ لپٹا کون ہے

چند اشعار میں علائم دیکھیں: دریا، فصیل، جنگل، نیلا سمندر اور کبوتر وغیرہ۔

شرط یہی ہے پیاس کو لب پر تھامے رکھو
جس رستے سے جاؤ گے دریا بھی آئے گا

فصیل شہر تو اب راستہ نہ روک مرا
بلا رہا ہے یہ جنگل ہرا بھرا مجھ کو

میں دشمنوں کی صفوں میں نکل گیا پاشی
خوش آ گیا تھا بہت خوں کا ذائقہ مجھ کو

منسوب ہو گئے ہیں یہ سب کس کے نام سے
سارے شجر پہ ایک بھی پتہ نہیں مرا

ہے تا حد نظر نیلا سمندر
بدن میں پھڑپھڑاتا ہے کبوتر

عادل منصوری

شکس طرح جمع کیجئے اب اپنے آپ کو
کاغذ بکھر رہے ہیں پرانی کتاب کے

ذرا دیر بیٹھے تھے تنہائی میں
تری یاد آنکھیں دکھانے لگی

عادل منصوری نے بی شک تھوڑی مگر فنی طور پر نہایت مکمل اور اعلےٰ قسم کی جدید شاعری کی۔ عادل منصوری نے پیکر تراشی پر زور دیا۔ ان کا لب و لہجہ نمایاں ہے۔ ان کے ہاں شاخ، پھل، پیلا بخار، بسمل تلوار وغیرہ الفاظ کا حسن استعمال ملاحظہ کریں۔

خود بخود شاخ لچک جائے گی
پھل سے بھرپور تو ہو لینے دو
جانے کس کو ڈھونڈنے داخل ہوا ہے جسم میں
ہڈیوں میں راستہ کرتا ہوا پیلا بخار

دریا کے کنارے پہ مری لاش پڑی تھی
اور پانی کی تہہ میں وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا

بسمل کے تڑپنے کی اداوں میں نشہ تھا
میں ہاتھ میں تلوار لیے جھوم رہا تھا

عادل منصوری کے بعض اشعار مکمل علامتی ہیں۔اسی لئے سہل لیذوں پر ناگوار گزرتے ہیں اور روکھے معلوم ہوتے ہیں۔دوسرے جدید تر شعرا کی طرح ان کا بعض کلام پڑھتے وقت حساس قاری استعاروں اور علامتوں کے جنگل میں بھٹکنے لگتا ہے لیکن کسے معلوم کہ یہ بھٹکنا بھی ہر روایت گزیدہ شخص کے لئے پرلطف ہے۔

سڑکوں پر سورج اترا
سایہ سایہ ٹوٹ گیا

دل کی اندھی خندق میں
خواہش کا تارا ٹوٹا

جسم کے کالے جنگل میں
لذت کا چیتا لپکا

سلیم احمد

سلیم احمد کا کوئی مخصوص لب ولہجہ نہیں انکی شاعری میں متنوع Shades ملتے ہیں۔

ہر دیا سوچتا ہے ساری عمر
رات کا سلسلہ کہاں تک ہے

لباس درد بھی ہم نے اتارا
یہ کپڑے اب پرانے ہو چکے ہیں

اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لیے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

یہ کیسے لوگ ہیں صدیوں کی ویرانی میں رہتے ہیں
انہیں کمروں کی بوسیدہ چھتوں سے ڈر نہیں لگتا

یہ اس نگاہ کی ایمائیت پسندی ہے
جو سامنے کی تھیں باتیں انہیں بھی راز کیا

بدن کی آگ کو کہتے ہیں لوگ جھوٹی آگ
مگر اس آگ نے دل کو مرے گداز کیا

سلیم احمد کے بارہ میں کہا گیا ہے وہ نزاعی بھی تھے، یعنی وہ حال کے بہتے ہوئے دھارے کی مخالف سمت چلتے رہے۔ شکوہ کناں رہے۔ فلسفیانہ فکر اشعار میں نمایاں ہے۔

تمام عمر کا حاصل سراب و تشنہ لبی
مرا قصور یہی تھا کہ سوچتا تھا میں

سلیم احمد کی شاعری فکر انگیز ہے۔ ان کے ہاں اندرونی کرب، تیکھے اشعار میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ منیر نیازی کے رومانوی لہجہ کے برخلاف سلیم احمد کے اشعار میں فکری عنصر غالب ہے البتہ وہ بھی منیر نیازی کی طرح نئی علائم سے گریز ہی

کرتے ہیں۔منیر نیازی کی شاعری قبولیت کے درجہ پہنچی لیکن سلیم احمد راستے میں ہی کھو گئے۔کشتی، ہوا، ساحل، سرحد، پرندے، سپاہی وغیرہ چند فرسودہ علائم کے سہارے

کشتیوں والے بڑھتے رہے بھنور کی سمت
اور میں چیختا رہا تیز ہوا کے شور میں

سمندر چیختا رہتا ہے پس منظر میں اور مجھ کو
اندھیرے میں اکیلے ساحلوں سے ڈر نہیں لگتا

یہ ممکن ہے وہ ان کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

غنیمِ وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

محمد علوی

وہ جنگلوں میں درختوں پہ کودتے پھرنا
برا بہت تھا مگر آج سے تو بہتر تھا

آفس میں بھی گھر کو کھلا پاتا ہوں میں
ٹیبل پر سر رکھ کر سو جاتا ہوں میں

ان علائم کی سطحیں ہر گز نئی نہیں بلکہ یہ تو پامال اور پس خوردہ علائم کو از سر استعمال

بلا رہا تھا کوئی چیخ چیخ کر مجھ
کنویں میں جھانک کے دیکھا تو میں ہی اندر تھا

بکھیر دے مجھے چاروں طرف خلاوں میں
کچھ اس طرح سے الگ کر کہ جڑ نہ پاوں میں

محمد علوی نے جدید تر غزل میں کئی تجربات کئے۔ خاطر نشین رہے تجربے کرنیوالے ہر قیمت پر نئے تجربات کرتے ہیں انہیں خواص وعوام کے رد و قبول کی پروا نہیں ہوتی۔ ان تجربات کی وجہ سے مٹھی بھر جدید تر شعرا نے غزل کے روایتی قصر میں پے در پے حملہ کر کے شگاف کئے. اس کے باوجود روایتی غزل کا چھت ابھی الووں اور چمگادڑوں کی جائے پناہ بنا ہوا ہے ہے۔

محمد علوی کی شاعری میں شعری چاشنی کم سے کم تر سہی مگر تجربہ کی تازگی اور عصری حسیت نمایاں ہے۔ کہیں کہیں ذائقہ بدلنے کے لئے کوئی علامت بھی مل ہی جاتی ہے۔ مثلاً سمندر، کنواں، سڑک وغیرہ۔

نظروں سے ناپتا ہے سمندر کی وسعتیں
ساحل پہ اک شخص اکیلا کھڑا ہوا

بلا رہا تھا کوئی چیخ چیخ کر مجھ کو
کنویں میں جھانک کے دیکھا تو میں ہی اندر تھا

ہاں بھٹکتے پھرو گے علوی
سڑک سے پوچھو کدھر گئی ہے

رفیق راز کا شعری اسلوب

اٹھی ہے تو محال ہے اب اس کا بیٹھنا
دو قافلوں کے بیچ میں حائل جو گرد ہے

کوئی اتر نہ سکا لفظ کے اندھیروں میں
کسی پہ کھل نہ سکا میرے بعد سناٹا

رفیق راز کے اشعار، تیز باد و باراں کے بجائے ابرِ نیساں کی طرح ہیں۔جس طرح ساون کی رم جھم بارش زمین کی پیاسی تہوں کو سیراب کرتی ہے ٹھیک اسی طرح یہ اشعار ہمارے ذہن کے خلیوں میں بیدار کرتے ہیں۔ان کے کلام موزوں میں بعض عمدہ علامتیں اور استعارے بھی مل جاتے ہیں۔مثلاً سبزہ، سبزہ پامال نہایت بامعنی علامت ہے۔

سبزہ تو دیکھ موسمِ گل میں بھی زرد ہے
آہستہ چل زمین کی چھاتی میں درد ہے

ادھر یہ تپتی ہوئی ریت ہی غنیمت ہے
ادھر وہ سبزہ نورستہ دام ہے سائیں

مجھ میں بھی تھی تیز سی خوشبو معنی کی
مہک رہا تھا میں بھی مہمل ہونے تک

یہاں استعاراتی زبان میں شعر کو پھول اور معنی کو خوشبو کہا ہے ۔رفیق راز اشعار میں خوبصورت دھندلکے پیدا کرتے ہیں اور کہیں کہیں پیکر تراشی کرتے ہیں اس میں شک نہیں ان کا اسلوب ذرا پیچدار ہے مگر گنجلک نہیں ۔ان کے اشعار عام فہم ہونے کے بجائے تہہ دار اور گرہ ناک ہیں ۔مثلاً ایک شعر

روشن نہ ہوسکا میں کسی روشنی سے بھی
مجھ میں نہ جانے کیسی عقیدت کی دھند تھی

اپنے اسلوب کے متعلق وہ کچھ یوں انکشاف کرتے ہیں:

کچھ میرا بھی کلام تھا الجھا ہوا بہت
کچھ اس کے ذہن میں بھی روایت کی دھند تھی

رفیق راز کے زیرنظر شعری مجموعہ کا نام "نخل آب" ہے ۔نخل تمنا اور نخل مرداب یعنی پانی میں اگنے والا پودا ہے یہ الفاظ فارسی میں مستعمل ہیں ۔نخل تمنا پر امیر مینائی کا شعر:

کاٹ کر پھینک دو جڑ، نخل تمنا کی امیر
نہ تو پھول آئے ہیں کمبخت میں نہ پھل آئے

نخل آب ایک نئی اور بامعنی ترکیب ہے جو رفیق راز نے غالباً اردو میں پہلی بار استعمال کی ہے ۔"الکلام یفسر بعضہ بعضا" کسی کے کلام کو سمجھنے کیلئے اس کا پورا کلام پڑھنا لازم ہے ۔میں نے "نخل آب" کی ترکیب و معنی کو سمجھنے کے لئے زیرنظر کتاب سے کچھ اشعار جمع کئے ہیں ۔مثلاً:

شاید ہٹا ہے غیب کا پردہ رفیق راز
آتا ہے "نخل آب" پہ شعلہ نظر مجھے

تازہ ہے باغِ دل اسی چشمِ پر آب سے
روشن دکھائی دیتا ہے امکاں کبھی کبھی

"مثل نورہ کمشکاۃ فیھا مصباح" کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں۔میرے خیال میں" نخل آب" انسان کے بدن اور اسکی آنکھ کا استعارہ ہے۔مزید دوسرے مقام پر "فانوس" علامتی لفظ سے بھی ظاہری چراغ قلب مراد لیا ہے۔ظاہر ہے فکر مبیں اس کی روشنی ہے۔"نور علیٰ نور" فانوس" رفیق راز کی دوسری بڑی علامت ہے۔فانوس پر بعض اشعار:

پانی کے فانوس میں تھا اک شعلہ میں
سر کو دیواروں سے کیا ٹکراتا میں

رفیق راز کی شاعری کی جڑیں روایت کے اندر پیوست ہیں فکری ماخذات کا سلسلہ اک طرف اردو ادب کے روایتی شعری نظام سے جڑتا ہے تو دوسری طرف جدید عصری حسیات سے مربوط ہے۔کلاسیک ادب پر انہیں دسترس حاصل ہے ان کے بعض اشعار کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے:

قدم روک مت، پیچھے مڑ کے نہ دیکھ
یہ آواز کم بخت دنیا کی ہے

(رفیق راز)

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

(میر تقی میر)

شورسگان دہر سے کہہ دو کہ لوٹ جائے
دیوار کی طرح ہے یہ دروازہ سکوت

(رفیق راز)

نوید سربلندی دی منجم نے تو میں سمجھا
سگان دہر کے آگے خدا ہو نیدوتا ہونے کا وقت آیا

(ہری چند اختر)

یہ آگ ہوس کی ہے میاں عشق نہیں ہے
روشن کوئی ہوتا نہیں اس آگ میں جل کر

(رفیق راز)

یہ آگ ہوس کی ہے جھلس دے گی اسے بھی
سورج سے کہو سایہ دیوار میں آئے

(شہریار)

پڑوس کے یہ نئے کچھ بلند بام مکاں
مرے بھی حصے کی اب دھوپ کھانے لگ گئے

(رفیق راز)

اونچی عمارتوں سے مرے گھر کو گھیر کے
کچھ لوگ میرے حصے کا سورج بھی کھا گئے

(جاوید اختر)

جاوید اختر کا شعر تقدیم اور تاثیر کے اعتبار سے معتبر ہے مگر سورج کھانے کے بجائے دھوپ کھانا میرے خیال میں فصیح ہے۔

زخمی پرندے آکے مرے بام پر گرے
پھر اس کے بعد صحن میں دو چار پر گرے

(رفیق راز)

شکیب جلالی کا شعر:

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

(شکیب جلالی)

رفیق راز اپنی شاعری کا محل روایتی ماخذات پر کھڑا کرتے ہیں۔لیکن ساتھ ساتھ اس کی تزئین و آرائش جدید ادبی حسیات سے بھی کرتے ہیں۔کنج خاموشی میں بیٹھ کر وہ عمیق شعر کہتے ہیں: ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ان کا شعر کہنے کا انداز پرانے اساتذہ سے ملتا ہے مثلاً ایک کلاسیکی شاعر کہتا ہے ۔حسد سے متعلق کہتا ہے۔

ہفتاد دو فریق حسد کے عدد سے ہے
میرا فریق وہ جو باہر حسد سے ہے

اسی شعر کے قبیل رفیق راز کے روایتی مواعظی اسلوب کے بعض اشعار:

پستی میں بھی ذلیل کا رتبہ بلند ہے
قرآن تک میں ذکر ہے پہلے رجیم کا

داخل ہوا ہوں خطہ لاریب میں میاں
ہاتھوں میں ہے چراغ الف لام میم کا

''نخل آب'' میں کئی مقامات پر شاعرانہ تعلی کی مثالیں ملتی ہیں۔اپنے اشعار کی داد وتحسین کے لئے دوسروں کو وہ کچھ یوں اکساتے ہیں۔

رفیق راز کا ایک شعر:

زندہ ہوتے تو داد بھی دیتے
ابن رشد و رشیق و جرجانی

ابن رشد فلاسفر اور عالم لسانیات بھی تھے۔رشیق سے مراد ابن رشیق ہے جو الجیریا کے عالم تھے۔سخن شناس تھے نقد شاعری پر ان کی کتاب ''کتاب العمدۃ فی معرفۃ صناعۃ الشعر ونقدہ وعیوبہ'' مشہور ہے۔جرجانی سے مراد یہاں اسمعیل جرجانی نہیں جنہیں الجرجانی کہتے ہیں اور نامور طبیب تھے بلکہ رفیق راز کی جرجانی سے غالباً مراد الاشعری سلسلہ کے عبدالقاہر الجرجانی ہے جو کہ اپنے وقت کے مشہور نحوی تھے۔رفیق راز کا یہ دقیق شعر پڑھ کر غالب کی تعلی یاد آتی ہے۔

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
غالب

پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری

شاخیں نکالنا مجھے مشکل تھا کس قدر
پیوست جڑ سے میں کسی بوڑھے شجر میں تھا

پرتپال سنگھ بیتاب کے اس شعر میں ہماری تہذیب کا المیہ اور ہمارے روایتی سماج کا رونا رویا گیا ہے ایسا معاشرہ کہ جس میں نئی نسلوں کے پھولنے پھلنے کی اکثر راہیں مسدود ہی دکھائی دیتی ہیں۔فرد کی تعمیر میں اسکی تہذیب اور اسکے معاشرے کا بنیادی رول ہوتا ہے. اگر سماج اپنے ہر فرد کی گرومنگ کی ذمہ داری نبھا نہ سکے تو وہ ناقص ہی سمجھا جاتا ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب نے یوں تو خوبصورت پھولوں کی مہکتی مالائیں پرو کر غزل کے مجسمہ پر سجائی ہیں ان کے اشعار کی خوشبو بوئے سرعت سے diffuse ہونے والی نہیں بلکہ ان کے اشعار زندہ جاوید ہیں۔مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ اگر انکی نظموں میں florence تعلیق عمل وقوع پذیر ہوا ہے تو غزلوں میں inflorence شگوفائی عمل کے واضع ثبوت ملتے ہیں انکے مختلف الموضوع اشعار، صنف سخن کے شجر پر پھولوں کے حسین اور معطر مرقعے ہیں۔

اب تک ان کے چھ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ان کے فن پارے قرطاس

کے صفحوں پر رواں دواں تصویروں جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے اشعار میں رنگا رنگ پیکر ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں اور بہت سے غمزدہ دلوں کو سکون و راحت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب نے اردو غزل کو کم از کم پانچ سونئی اور انچھوئی زمینیں فراہم کی ہیں۔

پیش خیمہ (۱۹۸۰) اور موجِ ریگ (۲۰۰۲) پرتپال سنگھ بیتاب کے ان دو شعری مجموعوں سے کچھ علامتی اور مشہور اشعار:

اتنا ہے بس یاد کہ ہم ڈوبے جس وقت
کئی سفینے تیر رہے تھے پانی میں

غلام ہوتے اگر خواہشوں کے اچھا تھا
پکڑ کے چھوڑی ہیں سو بار تتلیاں ہم نے

پگڈنڈیوں کے جال نے الجھا دیا ہمیں
وہ راستے کہاں گئے جو مستقیم تھے

اقتدار جاوید کی شاعری

اقتدار جاوید کا نام نظم کی دنیا میں ایسا ہی ہے جیسا کہ برگزیدہ فرشتوں میں سے کسی کا نام۔میں انہیں رزقِ خیال فراہم کرنے والا میکائیل عصر کہوں تو کسی مُلّا صفت ناقد کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے۔۔ اقتدار جاوید نے فن ترجمہ نگاری کے علاوہ غزل میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔

ان کی کتاب متن در متن پر دو قسطوں میں مجھ ناچیز کی باز دید بعنوان "متن در متن کا رویو" چھپ چکی ہے۔مزید غزل کا ایک مجموعہ بھی ان کی تخلیقات کی وقعت کو فزوں کر رہا ہے۔غالباً غزل خوانوں کے سرقے کی وارداتوں اور موضوعاتی یکسانیت سے متنفر ہو کر ہی وہ غزل گوئی سے تائب ہوئے ہیں۔میں سمجھتا ہوں ان کا یہ اجتہاد جدید تر غزل کی صنف کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا گیا ہے میری رائے ہے کہ آئندہ انہیں صرف اور صرف غزل ہی کہنا چاہئے... بہرحال جسقدر غزلیں انہوں نے کہی ہیں وہ بھی غیر معمولی کارکردگی ہے۔بات کمیت وکثرت کی نہیں ہوتی ہے دراصل بات معیار کی ہوتی ہے۔ان کی ہر ایک غزل،ان کے اسلوب کی نمائندہ سمجھی جاسکتی ہے۔اور ان کے معیار کی ترجمان۔

مزید ان کے غزلیہ شاعری میں ایک مخصوص قسم کی لوچ ہے۔جو حساس قاری کو نہ

صرف اپنی طرف ہمہ تن متوجہ کرتی ہے بلکہ اس کی سوچ کو ساری دنیا سے ہٹا کر کے اپنی گہرائیوں میں سمو لیتی ہے۔ان کی غزلوں میں تغزل کے علاوہ شعوری سطح پر جو عُمق ان کے ہاں پایا جاتا ہے وہ ان کے کمال فن کا بین ثبوت ہے۔

چند غزلوں کے خوبصورت مطلعے دیکھیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے میں بعض دفعہ مطلع ہی دیکھ کر غزل میں زورِ خیال اور الفاظ کا استعمال یا بصورت دیگر قبح وغیرہ دیکھ لیتا ہوں۔اگر مطلع تیرِ شستہ جیسا ہو جائے تو یقیناً پوری غزل اس کے ساتھ بسوئے بلندی کھینچی چلی جاتی ہے ثابت یہ ہوتا ہے کہ غزل کے تخیلیاتی آسماں میں پہنچنے کے لئے اس کا مطلع Propeller کا کام کرتا ہے۔ چند غزلوں کے نہایت خوبصورت مطلع دیکھیں :

کسی دن سیر گاہ آسماں سے ڈھونڈ لوں گا
اسے میں روشنی کے درمیاں سے ڈھونڈ لوں گا

یا مری راتوں کی چپ ہے یا ترے نام کی حمدیں ہیں
یہ ٹوٹے کنگرے مسجد کے شہر گمنام کی حمدیں ہے

بات حمد پر نہ رکے اب نعت کا شعر بھی ملاحظہ کریں۔

کسی سے گفتگو آغاز ہونا چاہتی تھی
خدا نے بولنا تھا تیس پارے بن رہے تھے!

اقتدار جاوید نے بعض مقامی الفاظ کو بھی داخل لغتِ اردو کیا ہے مثلاً بیر بہوٹی، سرخ گانی وغیرہ۔

تجھ سی اک بیر بہوٹی کے گزرنے سے ہوا
سرخ اینٹوں سے بنایا ہوا گھر اور بھی سرخ

الگ ہیں باغ میں رنگوں کی مستعمل زبانیں
پرندے کے گلے کی سرخ گانی گفتگو ہے

مضطر عارفی: ایک نغز گو شاعر

گھر کے کواڑ زیر زباں بولنے لگے
مالک چلے گئے تو مکاں بولنے لگے

مضطر عارفی (اصل نام : چوہدری محمد علی) نے روزمرہ کے ذاتی تجربات کو شعری قالبوں میں ڈالا ہے۔ مثلاً جن گھروں کو کچھ دن غیر آباد رکھا جاتا ہے ان کے دروازوں کے (hinges) قبضے زنگ آلود ہو جاتے ہیں اور لمبے عرصہ کے بعد کھلنے پر دوازے آواز دینے لگتے ہیں شاعر نے اس خیال کو مہارت سے برتا ہے۔

مضطر عارفی ''اشکوں کے چراغ'' شعری مجموعہ کے شاعر مضطر عارفی پنجابی اور اردو کے معروف شاعر ہیں۔ میں نے چند دن پہلے ان کے کچھ اشعار اکٹھے کئے ایک لنک پر ان کی کتاب دیکھ دل خوش ہوا۔

کانٹے اور پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے
پیاسوں کے درمیان ہیں پیالے پڑے ہوئے

میں بھی تو ہوں حسین ابن علی کا ثنا خواں
سر میرا سرِ عام قلم کیوں نہیں کرتے

اس سے پہلے مضطر عارفی کا ایک آدھ انتخاب میری نظر سے گزرا ہے۔ آج تک

جتنے بھی انتخاب مرتب کیے گئے ہیں کم ہیں، البتہ انتخاب کوئی بھی ہو کسی کا بھی ہو اس کے مرتب کرنے والے کی علمی لیاقت اور شعر فہمی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے میں نے اپنی پسند کے مطابق اشعار کا انتخاب کیا ہے، مجھے امید ہے کہ میرے انتخاب میں یکسانیت نہیں ملے گی۔

اس قدر انکار پر انکار سے
لگ نہ جاؤ تم کہیں دیوار سے
نظریاتی مملکت بننے کے بعد
کیسے کیسے بھوت نکلے غار سے
ہم بھی گذرے پا بجولاں سر بکف
شام سے اور شام کے بازار سے

افتخار نسیم عفتی کی شاعری

بارشوں کے بعد ست رنگی دھنک آجائے گی
کھل کے رولو گے تو چہرے پر چمک آجائے گی

مجھے پہلے پہلے جو دیکھ کر، ترا حال تھا مجھے یاد ہے
کبھی جل گئیں تری روٹیاں، کبھی ہاتھ تو نے جلا لیا

مطابقت نہ تھی باہم سو، اسکو چھوڑ دیا
وہ میرے تن پہ پرایا لباس لگتا تھا

کٹی ہے عمر کسی آب دوز کشتی میں
سفر تمام ہوا اور کچھ نہیں دیکھا

بہتی رہی ندی مرے گھر کے قریب سے
پانی کو دیکھنے کے لیے میں ترس گیا

اگرچہ پھول یہ اپنے لیے خریدے ہیں
کوئی جو پوچھے تو کہہ دوں گا اس نے بھیجے ہیں

اوپر لکھے گئے اشعار میں" آب دوز کشتی، روٹیاں وغیرہ وغیرہ جیسی علامتیں کس قدر تازہ ہوئی ہیں۔ مجھے تو افتی جیسے اعلیٰ شاعر گنتی کے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں ہمالائی چشموں کے مصفا آب جیسی ندرت اور کسی من روپی سرووَر میں بادصبا کے زیراثر اٹھنے والی سے موجوں کی مدہم سرگوشیاں دیکھنے اور سننے کے لائق ہے۔سیال لفظوں کے یہ من موہت چرتر! بقول فریدون مشیری

ہمہ تن چشم شدم خیرہ بہ دنبال تو گشتم
شوق دیدار تو لبریز شد از جام وجودم

افتخار نسیم عفتی کی شاعری میں اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔اسلوب کی سطح پر انفراد، اس تگ و تاز کی دنیا میں لذت تنہائی اور اشعار کی تہہ میں جذباتی تموج، اور ایسی فکری رو جو قاری کو دور تک اپنے ساتھ بہا لے جائے۔فن کی کمال پختگی مترنم رواں بحور کا انتخاب، الفاظ کی نشست و برخاست، انسانی معاملات کا درو بسط، فکر کی کشاد و وسعت۔الغرض افتی کی شاعری گوناگوں صفتوں سے متصف ہے۔

بقول افتخار نسیم:

طاق پر جزدان میں لپٹی دعائیں رہ گئیں
چل دیئے بیٹے سفر پر گھر میں مائیں رہ گئیں

نہ جانے کب وہ پلٹ آئیں در کھلا رکھنا
گئے ہوئے کے لیے دل میں کچھ جگہ رکھنا

کوئی بادل میرے تپتے جسم پر برسا نہیں
جل رہا ہوں جانے کب سے جسم کی گرمی کے ساتھ

افتخار نسیم جسے ریختہ پر عفتی نسیم اپ لوڈ کیا گیا ہے ایک ہی شاعر ہے۔ پورا نام افتخار نسیم افتی ہے۔عفتی اردو کی "Gay" شاعری کا ابونواس ہے۔ان کی شاعری میں معاشرتی تناو،احتجاج اور مزاحمتی رویہ کی عکاسی ملتی ہے ۔ (MYRMECOPHILE) نظموں کا مجموعہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ وہ فیصل آباد میں ہے ہجڑوں کی سنگت" مڑھی" میں بھی رہے۔جب انھوں نے محسوس کیا کہ وہ پاکستان میں "gay" ہونے کے سبب غیر محفوظ ہیں تو وہ امریکہ نقل مکانی کر گئے۔وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ عورت بھی ہیں اور مرد بھی۔یعنی نر مان۔" یہ واقعہ مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ وہ جب قراۃ العین حیدر سے ملنے گئے تو اپنی جیب سے لپ اسٹک نکال کر ان کے ہونٹوں پر لگانے لگے۔

سعود عثمانی اور الیاس بابر اعوان کی غزلیہ شاعری

بقول **سعود عثمانی**:

ہزار درد کے کانٹے چبھو گیا ہے سعود
وہ ایک شخص جو پھولوں پہ چلنے والا ہے

ابھی یہ بیج کے مانند پھوٹتا ہوا دکھ ہے
بہت دنوں میں کوئی شکل اختیار کرے گا

سعود عثمانی کی غزلوں بنیادی طور پر اقبال کا رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔لیکن جدید حسیت کا عنصر بھی موجود ہے۔بعض اشعار نہایت خوبصورت کہے ہیں۔''قوس ''شعری مجموعہ میری نظر سے گزرا ہے اس میں غزلیں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔موٹے حروف نے کتاب کے حجم کا بھرم قائم رکھا ہے ان کی کتاب ''بارش'' کے سرورق لکھے ہوئے ہیں یہ الفاظ: ''احمد ندیم قاسمی ایوارڈ ۲۰۰۷ء''

اس بارہ میں متردد ہوں کیا پتہ ہے اس جملے کے اعلان کی جگہ مناسب تھی بھی یا نہیں۔البتہ یہاں جملہ پڑھ کر حیرت ہوئی۔''قوس''سعود عثمانی کی دوسری کتاب ریختہ سے پڑھنے کو ملی۔اس کتاب کے سرِورق پانچ اشعار کی نمایش کی گئی ہے جن میں قابل انتخاب اشعار بمشکل دو تین ہیں نیز۔کتاب کے فلیپ پر خورشید رضوی رقم طراز

ہیں:

''اردو غزل کے جدید تر نمائندوں میں بہت کم لوگ ہیں جو سعود عثمانی کی نفاستِ کلام کو پہنچ سکتے ہیں. سعود عثمانی نے۔

''ثابت کیا ہے کہ شعر ظاہر کے تجربوں سے نہیں باطن کے ولولوں سے زندہ رہتا ہے. اس نے کوئی نام نہاد جدت طرازی نہیں کی کوئی مضحکہ خیز تجربہ نہیں کیا..... اسکے زندہ لمس سے خوابیدہ الفاظ اور غنودہ ترکیبیں جاگ اٹھی ہیں ان میں زندہ مفاہیم لو دینے لگے ہیں.....''

حسب روایت سعود عثمانی کے دوسرے شعری مجموعہ یعنی قوس کے صفحات پر جلی حرفوں سے لکھا ہے۔''وزیر اعظم ادبی اوارڈ (اول) ۱۹۹۷''یہ کتاب سرے تک پڑھنے سے پتہ چلا کہ اچھے اشعار کے مقابلے بھرتی کے اشعار زیادہ ہیں۔اور اکثر عامیانہ اشعار کو پڑھ کر مایوسی ہوئی۔تاہم بعض تابندہ موتیوں کی چمک حاصل مطالعہ سمجھتا ہوں۔اشعار دیکھیں:

میں زرد بیج ہوں اور سبز ہونا چاہتا ہوں
مری زمیں تری مٹی کا مشورہ کیا ہے

بکھر رہا ہوں تری طرح میں بھی اے زرِ گل
سو تجھ سے پوچھتا ہوں تیرا تجربہ کیا ہے؟

راکھ سے پھوٹتی کونپل کو تو دیکھو کہ یہ بات
کتنی دشوار تھی اور کیسے ادا ہوگئی ہے

الیاس بابر اعوان :

عید کے دن بھی نکلتے نہیں گھر سے باہر
مرے بچے مری غربت کا بھرم رکھتے ہیں

اک چڑیا مجھ سے بھی پہلے اٹھتی ہے
جیسے اس کو دفتر جانا ہوتا ہے

یار کتابیں کتنی جھوٹی ہوتی ہیں
ان میں کوئی اور زمانہ ہوتا ہے

گھر کے اندر اتنی گلیاں پڑتی ہیں
کبھی کبھار ہی باہر جانا ہوتا ہے

رستے میں اک ٹاپو پر کچھ ٹھہریں گے
میں برگر اور پیپسی لے کر آتا ہوں

جدید لب ولہجہ کے شاعر ہیں انکی شاعری میں ہر طرح کے اشعار موجود ہیں۔ عامیانہ سطحی سے لیکر ذوالمعنی بلکہ علامتی بھی وہ شاعری میں اپنا اظہارِ خیال وتجربات پیش کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں علم و دانش وفن آوری کی مثالیں عام مل جاتی ہیں۔الیاس بابر اعوان کہیں بھی مضحکہ خیز تجربہ نہیں کرتے جہاں تک میرے دیکھنے میں آیا ہے، شاعری کے حوالہ سے سنجیدہ روش اختیار کی ہے۔اشعار دیکھیے:

رکاوٹیں تو سفر کا جواز ہوتی ہیں
یہ راستہ کہیں ہموار ہو گیا تو پھر!

جو میری راہ میں پتھر گرا کے جاتا ہے
میں اس کی راہ سے پتھر ہٹا کے چلتا ہوں

کام سارے درست تھے میرے
جب مجھے کوئی ٹوکتا نہیں تھا

روایتی الفاظ بھی کہیں برتے ہیں مثلاً "صیاد" لیکن یہاں دوسرے مصرع میں لفظ تماشا بمعنی شعبدہ نے شعر میں تازگی پیدا کر دی ہے۔

آخری سانس ہے کچھ مجھ پہ کرم ہو صیاد
دیکھ اب اور تماشا نہیں کر سکتا میں

سچ لکھنے والے سب ہجرت کر جائیں گے
بازاروں میں قلم دواتیں رہ جائیں گی

ابہام جدید شاعری میں عیب کے بجائے صنعت سخن اور ہنر کاری مان لیا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے:

کبھی کبھار اسے پھل پھول لگنے لگتے ہیں
ہمارے شانوں پہ جو بار رکھا ہوتا ہے

میں نے عدو کے خیمے میں بھیجا ہے اک چراغ
یہ عین انتقام سے آگے کی بات ہے

ان سے ہی سنگھار کی چیزیں بنتی ہیں
جن پیڑوں کے جسم پہ آرا لگتا ہے

''آرا لگتا ہے'' کتنا ہی عمدہ استعمال ہوا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کسی شاعر نے الیاس بابر اعوان کی دیکھا دیکھی۔ درختوں کے متعلق اسی ترکیب کو منقلب کر کے ''آرے لگنے'' کہا جو کسی طرح فصیح نہیں ہو سکی۔ تجربہ کرنا الگ ہے شاعری میں لفظ اس طرح فٹ کرنا کہ خوبصورت لگنے لگے یہ کوئی وہبی ہے۔ ''شعر چیزے دیگر است'' اچھا شعر کہنا محض اکتسابی عمل کا نتیجہ نہیں ہو سکتا ۔

حمیدہ شاہین، رحمان حفیظ اور سدرہ سحر عمران کی شاعری

نگاہ بھر کر تری کائنات دیکھ سکوں
مرے وجود سے باہر کبھی اچھال مجھے

حمیدہ شاہین : کے شعری مجموعہ" دشت وجود" کے سرِ ورق پر لکھا یہ شعر پڑھ کر طلب پیدا ہوئی کہ کتاب کھولوں۔ وہ روایتی سانچوں میں رہ کر الفاظ و معنی کے کرتب دکھاتی ہیں. اپنے عہد کی اہم نسوانی آواز ہیں۔

میں اپنی چادر کے کتنے ٹکڑے کروں گی آخر
گلی گلی میری بیٹیاں ننگے سر کھڑی ہیں

ان کے ہاں بعض غزلوں میں روایتی مضامین بھی ہیں کہیں کہیں ایسی تراکیب کے پلندوں سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ مثلاً ریگ فسوں، چشم حیرت، طشت تخیل، عصائے حرف، فضائیں مرتعش، ساغر ہستی، صاعق رفتار، زرِ خلوص، طعن اغیار" صید گیر خوش خصال و خوش ادا" ضوفشاں وغیرہ۔ لیکن مجموعی طور ہر انہوں نے بہت سی بحور میں مہارت سے بعض عمدہ اشعار بھی کہے ہیں۔

رحمان حفیظ:

جدید غزل کی کئی قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم یہ بھی ہے کہ روایتی سانچوں میں

موضوع اور الفاظ کو بدل دینا ہے یعنی غزل کے روایتی فریم فرک کے اندر رہتے ہوئے الفاظ و موضوع کے ذریعے ایسی غزل کہنا جو سننے والوں کو بورنگ نہ لگے بلکہ نئی لگے۔ایسی غزل میں شوکت الفاظ کے بجائے سلاست و روانی ہوتی ہے. رحمان حفیظ کامیاب غزل گو ہیں اور اسی قبیل کی غزلیں کہتے ہیں انکے بعض اشعار مجھے بہت اچھے لگے... پسند اپنی اپنی۔

عجیب شہر میں میرا جنم ہوا ہے جہاں
بَدی کا حل کوئی نئیں، نیکیوں کا پھل کوئی نئیں

مرا سخن، مرا فن دوسروں کی خاطر ہے
درخت ہوں، مری قسمت میں اپنا پھل کوئی نئیں

سدرہ عمران سحر: زود گو شاعرہ ہیں نوعمر ہیں لیکن شعر کہنے کا ہنر خوب آتا ہے پہلے پہلے لوگ ذہن میں پکا پکا کر شعر کہتے تھے انکے شعر کہنے کا عمل ہانڈی کے ابال جیسا تھا تھا۔بقول ولیم ورڈزورتھ:

Poetry is spontaneous over How of Thoughts.

پرانے عہد اور دور وسطیٰ کے اچھے عالمی لیول کے شعرا کی شاعری مقدار کے اعتبار سے قلیل ہوتی تھی لیکن معیاری ہوتی تھی اور تاثیر والی ہوتی ہے۔وقت بدل چکا ہے نہ تو آجکل شعراء کے تحت الشعور کے پروپلر میں ویسی قوت رہی. اور نہ ہی ویسے سامعین رہے۔مزید ذہن کی کچی پکی تخیلاتی نہروں سے باغِ اظہار تک آتے آتے بیشتر آبِ خیال ضائع ہو جاتا.....لہٰذا ابیاں میں تشنگی رہ جانا نئی بات نہیں۔اس ذہنی انتشار کے دور میں شعر کہنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔مجھے خوشی ہو رہی کہ سدرہ عمران سحر فریحہ نقوی جیسی باصلاحیت باعزم اور نمائیندہ جسارت خواتین

اس دور بحرانی شعر مردوں کے شانہ باشانہ شعر کہتی ہیں۔ اشعار بطور نمونہ۔

مجھ کو تو خیر خانہ بدوشی ہی راس تھی
تیرے لیے مکان بنانا پڑا مجھے

فرحت عباس شاہ کی شاعری

غالباً اس صدی میں درد وغم کو لفظوں میں پینٹ کرنے والا نمایندہ شاعر فرحت عباس شاہ ہی ہے۔ان کے ہاں محبوب کی جھلکیوں اور تصویر کشی کے بجائے ہجر و فراق کی محزونی کیفیت پائی جاتی ہے۔فرحت عباس شاہ،وصال کی لذت کے بجائے ہجر کی تڑپ ہی کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں ..... وصال تو سچے عاشقوں کے نزدیک تڑپ کی موت ہے اور اختتامِ سفر کی دلیل.....اسلئے بعض دفعہ وہ اس سے گریز کرتے ہیں.. ایسی صورت میں انکا یہ الم یہ درد آفاقی بن جاتی ہے... غم جاناں کی کڑیاں غمِ جہانیانِ جہاں سے مل جاتی ہیں. میرے خیال میں یہی انکی غزل کی نمایاں ترین صفت ہے جو انہیں انکے مدِمقابل شعراء سے متمیز اور ممتاز کرتا ہے وہ حسن و جمال کی انتہا دیکھنے کے لئے بیقرار رہتے ہیں اسی دھن میں میں نئے تجربے کرتے چلے جاتے ہیں انکے چھیالیس مجموعے آچکے ہیں لیکن یہ سفر زندگی کی آخری سانس تک ختم ہونے والا نہیں لگتا ہے۔ان کی ذہنی و جذباتی سچائی نے انہیں مقامِ انفراد تک پہنچایا ہے...انکے قلم سے وہ موتی نکلے ہیں جن کی چمک اور روشنی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔لہٰذا عوام وخواص میں مقبول ترین شعرا میں سیا یک بڑا نام فرحت عباس شاہ کا ہے۔

ان کے تخیل کا بادپا گھوڑا نت نئے میدانوں اور اجلی فضاوں میں سرپٹ دوڑتا رہتا ہے. انکے ہاں الفاظ جنگلی پھلواڑیوں کی طرح مہکتے ہیں۔جن میں فطری لوچ خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔

درد کے یہ بارہ ماہی پھول کبھی کملاتے نہیں دکھائی دیتے ہیں... یہ شاعر نہیں حقیقی معنی میں ساحر ہیں... ان کی غزلیں پھولوں کی ٹوکریاں ہیں انکے ہر شعر میں پروئے الفاظ سچے اور سچے موتی کی لڑیاں ہیں۔

ان کے ہاں زبان سہل ممتنع، لہجہ عوام کے اتنا قریب کہ آج شاید ہی جس کی کوئی دوسری مثال کہیں ملے۔جس شاعری کی جڑیں عوام میں ہوں وہ مرتی نہیں۔ان کے کلام سے اٹھنے والی ہجر و فراق اور درد و غم اور سوز دروں کی چنگاریاں چنگاریں نہیں رہتی بلکہ دلوں کے برجوں پر پہنچتے ہی اثر انگیزی میں کمال دکھاتی ہیں۔انکے سخن دل دل میں پھیلی سرد اور اندھیروں رات میں جلنے والے الاو جیسی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار ٹھٹھرتی دنیا کو نرالی حرارت جوش اور تمازت دیتے ہیں۔

شہر ویران کے دروازے سے لگ کر روئے
اپنی پہچان کے دروازے سے لگ کر روئے

ہم ستائے ہوئے دنیا کے ترے بعد اکثر
تیرے احسان کے دروازے سے لگ کر روئے

کوئی آواز تسلی نہ دلاسہ نکلا
کیسے انسان کے دروازے سے لگ کر روئے

سحر سسکتے ہوئے آسمان سے اتری
تو دل نے جان لیا یہ بھی سال درد کا ہے

یہیں کہیں مرے اندر کوئی تڑپتا ہے
یہیں کہیں پہ کوئی یرغمال درد کا ہے

زین شکیل کی شاعری

میں نے سورج پر سیاہی پھینک دی
موم کا اک گھر بچانے کے لیے

زین شکیل ایک ایسے سجیلے نوجوان شاعر ہیں جنکے تخیل، جن کا سوز وگداز خوشبوں کی نت نئی تصویریں بناتا ہے۔جن کی نظمیں دریاوں کی روانی کو مات کرتی ہیں۔جن کی غزلوں کے اشعار رنگا رنگ پھولوں کے رنگ اڑاتے ہیں۔جن کے اشعار بھولی بھٹکی خوابوں کے قافلوں کو راہ دکھاتے ہیں اور کیفیت کی" وادیِ گلپوش" میں پہنچا کر مشام جاں کو ایسی مہک سے حظ یاب کرتے ہیں کہ ان کے اشعار سننے والا مجسمہ حیرت بن جاتا ہے۔ بہتے دریا کی موجوں میں عکس ہزار خورشید کا جلوہ دکھانے والا اس شاعر کا لب ولہجہ فرحت عباس سے مختلف ہے ان کے ہاں گاہے حسن کو پس پردہ کے اور گاہے روبرو دیکھا جاسکتا ہے. میں نے ان کی زائد از سو مشہور غزلوں سے یہ انتخاب مرتب کیا ہے۔

کچھ غزلوں سے چند اشعار:

خموش رہ کے بھی باتیں ہزار کرتے ہو
ہنر کہاں سے تجھے آئے بولنے والے

جب بھی وہ پیار سے لیتا ہے مرا نام کبھی
لوگ پھر کیوں مرے ہم نام نکل آتے ہیں

مجھے زمین پہ رہنے کا شوق ہی کب تھا
گرا ہوا ہوں کسی آسماں سے، پہلے ہی

اسحاق وردگ کی شاعری پر ایک طائرانہ نگاہ

پاکستان سے اکیسویں صدی میں شاعری کی جو نئی آوازیں انڈیا کے ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئیں، ان میں اسحاق وردگ کی منفرد آواز بھی شامل ہے۔ان کی شاعری صاحب اسلوب شاعر ظفر اقبال کے کالم میں مسلسل چھپ رہی ہے۔اسحاق وردگ کی شاعری پر ڈاکٹر طارق ہاشمی اپنے مطبوعہ مضمون" اسحاق وردگ، جدید حسیات کا شاعر" میں لکھتے ہیں:

''اسحاق وردگ کے ہاں ایک توازن بھی نظر آتا ہے اور
اُن جدید پیرایوں کا شعور اور تلاش بھی نظر آتی ہے جو اس
وقت جدید شعرا اختیار کرتے ہوئے اردو کے شعری
سرمائے میں بڑے تخلیقی اضافے کر رہے ہیں''

اسحاق وردگ کا تعلق پشاور سے ہے لہذا ان کے کلام میں پشاور کے حالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اکیسویں صدی کی نئی حسیات، وجودی فکر، مابعد الطبیعاتی افکار، تصوف، فرد کی تنہائی و احساس رائگانی، شناخت کا مسئلہ، انسانی اقدار کی شکستگی کے مضامین بھی ملتے ہیں۔

چاک پر بے بسی بناتا ہوں
یعنی میں زندگی بناتا ہوں

خواب نے رکھ لیا نشانے میں
تم نے تاخیر کی جگانے میں

دیوانوں کے مانند مرے شہر کے سب لوگ
دستار کے قابل کوئی سر ڈھونڈ رہے ہیں

میں خالی گھر میں بھی تنہا نہیں تھا
کہ جب تک آئنہ ٹوٹا نہیں تھا

ہمارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا
وہ اک بندہ خدا ہونے سے پہلے

جو فیصلہ سرِ دربار ہونے والا تھا
وہ فیصلہ پسِ دیوار ہونے والا ہے

تمہاری یاد کو کیسے مٹاوں
کہ باقی کچھ نہیں بچتا ہے مجھ میں

پہلے تو شہر کے سب خواب جلائے اس نے
اور پھر راکھ کو تعبیر کا عنوان دیا

خیرات میں دے آیا ہوں جیتی ہوئی بازی
دنیا یہ سمجھتی ہے کہ میں ہار گیا ہوں

دروازے کو اوقات میں لانے کے لیے میں
دیوار کے اندر سے کئی بار گیا ہوں

نیچے دیے گئے شعر میں وہ جنان یعنی Heavens سے پلٹ کر زمین پر آنے کی بات نئے ڈھنگ سے کرتے ہیں اور اسطرح وہ تخلیقی سچائی کا جواز مہیا کرتے ہیں:

اب زمیں پر یہ تعارف ہے مرا
آسماں سے بھاگ کر آیا ہوں میں

اسی طرح ایک اور شعر میں وردگ اپنی زبانی جگ بیتی پیش کرتے ہیں۔ شاعرانہ تعلی اور بہروپ کی روایت کے برخلاف، دل پر گزرنے والی واردات کو بیان کر کے، وہ کمال آزادگی اور خود احتسابی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ شعر:

آج بیمار پڑا ہوں تو مجھے یاد آئے
خاص کچھ لوگ جنہیں چارہ گری آتی ہے

بیشک اسحاق وردگ کے یہاں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو ہمیں شعری تجربے کے نئے احساس سے روشناس کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خواب و بیداری عام سے الفاظ ہیں لیکن نیچے دیے گئے شعر میں انہوں نے تخلیقی لمس سے جو معنوی غرابت پیدا کی ہے وہ لاجواب ہے۔

میں اُس سے خواب کے رستے پہ ملنے آیا ہوں
مگر وہ نیند سے بیدار ہونے والا ہے

سورج لفظ کو علامت کے طور کئی شعرا نے استعمال کیا ہے۔ مثلاً شہریار کا شہر:

یہ آگ ہوس کی ہے جھلس دے گی اسے بھی
سورج سے کہو سایہ دیوار میں آئے

اسحاق وردگ نے نیچے دیے گئے شعر میں "سورج" کو ایک طرح سے defamilarize کرکے دیرپاب معنی تخلیق کئے ہیں۔

وہ لوگ جو سورج کو بچانے نہیں نکلے
اب راکھ کی بستی میں شرر ڈھونڈ رہے ہیں

ایسا ہی ایک اور خوبصورت شعر:

اندھیری رات مجھے جاننے سے قاصر ہے
تو روشنی سے کبھی پوچھ لے پتا میرا

لیاقت جعفری اور نذیر قیصر کی غزلیہ شاعری

لیاقت جعفری کے چند اشعار:

پڑے پڑے نئی زرخیزیاں نکل آئیں
کٹے درخت میں پھر ٹہنیاں نکل آئیں

عشق تو نے بڑا نقصان کیا ہے میرا
میں تو اس شخص سے نفرت بھی نہیں کر سکتا

جس کو تم چاہو کوئی اور نہ چاہے اس کو
اس کو کہتے ہیں محبت میں سیاست کرنا

میرے قبیلے میں تعلیم کا رواج نہ تھا
مرے بزرگ مگر تختیاں بناتے تھے

لیاقت جعفری الفاظ کو ہنر مندی سے برتنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں یہی وجہ ہے انکے اشعار سبک و ملائم ہیں اور لب و لہجہ مقبول ہے۔ان کے کلام سے ہر قسم کا سامع اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق حظ اٹھاتا ہے۔

سفر الجھا دیئے ہیں اس نے سارے
مرے پیروں میں جو تیزی پڑی ہے

پیروں میں تیزی پڑنا عجلت پسندی کا استعارہ ہے۔ یہاں اس شعر کا سارا حسن دوسرے مصرع میں منفی رد تشکیل کے باعث ہے:

میں بہت جلد لوٹ آؤں گا
تم مرا انتظار مت کرنا

اگر اچھے شعر کی تشریح کرنا اسکے حسن کو مجروح کرنے کے مترادف نہیں ہوتا تو میں ایسی اور بھی مثالیں وضاحت سے پیش کرتا۔شعر:

جہاں جو تھا وہیں رہنا تھا اس کو
مگر یہ لوگ ہجرت کر رہے ہیں؟

نذیر قیصر

بچہ حرف کو چھو کر زندہ کر دیتا ہے
ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں

نذیر قیصر کی زبان سادہ اور اشعار میں فقط اکہری پرت کے سوا کچھ ہے نہیں البتہ دانیال طریر نے معاصر تھیوری اور تعین قدر میں حزقی ایل سروش کے حوالہ سے اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے، بڑے پتے کی بات کی ہے۔اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ شاعر تخلیقی لمس سے الفاظ کو زندہ کر دیتا ہے۔اور ایسے لمس کے لئے طفلانہ معصومیت اور سچی محبت بنیادی شرطیں ہیں۔

جب سرائے کے لوگ سو جائیں
ہم ستارے کے ساتھ ہو جائیں
سلامت ہوں جدا ہو کر بھی تم سے
مجھے برباد ہونا چاہئے تھا

نیند آتی ہے تو پھر نیند کے ساتھ
خواب آتے ہیں جگانے اس کے

یہاں لفظی تعقید نے الجھن پیدا کر دی ہے دوسرا مصرع کی نحوی ساخت یوں ہے یعنی

''خواب اس کے جگانے آتے ہیں''

ہوائے وصل اس کے پیراہن میں
نئی بیلیں بنانا چاہتی ہیں

چلتے چلتے میں اس کو گھر لے آیا
وہ بھی اپنا ہاتھ چھڑانا بھول گیا

کچھ نئی شکلیں ہیں آوازوں میں
کچھ نئے نام بلاتے ہیں مجھے

شاہد ذکی کی شاعری

وہ جو اس پار ہیں ان کے لئے اس پار ہوں میں
یہ جو اس پار ہیں، اس پار سمجھتے ہیں

یہ کس بلندی پہ لا کر کھڑا کیا ہے مجھے
کہ تھک گیا ہوں توازن سنبھالتے ہوئے

کوزے بنانے والے کو عجلت عجیب تھی
پورے نہیں بنائے تھے سارے بنائے تھے
پھر یوں ہوا کہ اس کی زباں کاٹ دی گئی
وہ جس نے گفتگو کے اشارے بنائے تھے

سنو یہ تیغ اٹھانا ہمارا کام نہیں
یہ وہ اٹھاتے ہیں جن سے قلم نہیں اٹھتا

اس شعر میں تیغ اور قلم کا کیا ہی خوبصورت موازنہ کیا ہے۔ شاہد اس دور کے ان گنے چنے شعرا میں آتے ہیں جو اس یک رنگ شعری مجموعوں اور یک چہرہ شعری تجربات کی بھیڑ میں رہ کر اپنی انفرادی پہچان بنانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے

ہیں. وہ مدہم لہجے کے شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں جدیدیت عنصر ملتا ہے۔تخیل کی بلندی اور زبان میں ندرت ضرور ہے۔

اے آسمان تیری عنایت بجا مگر
فصلیں پکی ہوئی ہوں تو بارش فضول ہے

نام و ناموس اور شہرت سے گریزاں ہیں وہ کسی بھی جھوٹی قسم کی سنجیدگی کو اپنے اوپر نہیں اوڑھتے بعض شعروں سے انکے مزاج کی سچائی صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔

انعام ننگ و نام مرے کام کے نہیں
مجذوب ہوں سو میری ستائش فضول ہے

ان کی شاعری سے تجرد بی نیازی کے علاوہ صوفیانہ رنگ چھلکتا ہے وہ خود احتسابی اور محاسبہ کے علاوہ تصنع اور بناوٹی پن سے متنفر ہیں۔

ایسا بدلا ہوں ترے شہر کا پانی پی کر
جھوٹ بولوں تو ندامت نہیں ہوتی مجھ کو

اتنا مصروف ہوں جینے کی ہوس میں شاہد
سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہوتی مجھ کو

لاشوں میں ایک لاش مری بھی نہ ہو کہیں
تکتا ہوں ایک ایک کو چادر اٹھا کے مَیں

بعض تلمیحات بھی انکے کلام میں ملتی ہے:

یوں مجھے تیری صدا اپنی طرف کھینچتی ہے
جیسے خوشبو کو ہوا اپنی طرف کھینچتی ہے

کیا کہوں قرب کی یہ کونسی منزل ہے جہاں
نہ میں دیتا ہوں تجھے وقت نہ تو مانگتا ہے

حرفِ غلط نہ تھا مجھے سمجھا گیا غلط
لکھا گیا غلط کبھی بولا گیا غلط

روشنی بانٹتا ہوں سرحدوں کے پار بھی میں
ہم وطن اس لیے غدار سمجھتے ہیں مجھے

افضل گوہر راؤ
لفظ کا سائیں اور معنی کا سوامی

افضل گوہر کو میں لفظوں کا سائیں اور معنی کا سوامی اور عہد حاضر کا مقبول شاعر سمجھتا ہوں۔ بقول افضل گوہر:

یہ تیر یوں ہی نہیں دشمنوں کو لگ جاتے ہیں
بدن کا سارا کھچاو کماں پہ پڑتا ہے

تم سے ایسے ہوگیا ہے رابطہ دیکھے بغیر
جس طرح ہم سانس لیتے ہیں ہَوا دیکھے بغیر

ایک دُنیا کے یہاں کام کئی ہوتے ہیں
یہ وہ عورت ہے جو اولاد بہت رکھتی ہے

میری اُس سے کوئی ایسی دشمنی ہرگز نہ تھی
میں فقط اُس سے لڑا اپنے بچاو کے لئے

دیکھتا ہوگا سمندر بھی کوئی خواب ضرور
یوں جزیرے جو سرِ آب نکل آتے ہیں

یہ کون نیند میں آ کر سرہانے بیٹھ گیا
میں اپنا خواب کسی کو بتانے والا نہیں

بینائی مری جا کے پلٹ کر نہیں آئی
کیا دیکھ لیا آنکھ نے منظر سے زیادہ

یہ کشتیوں والے تو یونہی خوفزدہ ہیں
دریا کی تو ہر موج کنارے سے جڑی ہیں

چند لوگوں کی محبت بھی غنیمت ہے میاں
شہر کا شہر ہمارا تو نہیں ہوا

اُس خواب کا اسیر ہوا ہوں کہ دن میں بھی
آنکھوں کو موند لوں تو نظارہ اُترتا ہے

میں نے یہ سوچ کے دشمن کو بھی ٹھکرایا نہیں
بعض پتھر بڑے نایاب نکل آتے ہیں

آپ نے، ہم نے " پتھر " لفظ پر بہت اشعار سنے ہوئے ہیں۔ایک زمانہ مجھے شعر اکٹھا کرنے شوق چڑھا تھا کچھ یونہی سمجھئے جیسے کوئی حریص پائی پائی جمع کر کے سیٹھ بن جاتا ہے میں نے کئی سالوں کی رایاضت شاقہ سے کئی اشعار اکٹھا کئے۔یہ انٹرنٹ سے پہلے کی بات ہے..اور آج گوگل مہربان ہے ذرا سرچ ماریں تو اسی لفظ" پتھر " پر آپ کو بھی درجنوں اچھے اشعار مل جائیں گے۔لیکن میرے خیال میں افضل گوہر کا یہ شعر نرالا ہے۔شعر دیکھیں:

میں نے یہ سوچ کے دشمن کو بھی ٹھکرایا نہیں
بعض پتھر بڑے نایاب نکل آتے ہیں

سیدھے سادے الفاظ اتنا بڑا شعر کہنا معجز بیانی نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک اور شعر "پتھر" لفظ پر۔

اب تو بھی آئنے کی طرح بولنے لگا
پتھر سے بھر نہ دوں ترے منہ کا شگاف میں

یہ اشعار افضل گوہر کے پختہ شعری مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ افضل گوہر نے سینکڑوں لاجواب زمینیں ایسی تراشیں ہیں۔ عصر حاضر کے کم شعرا اس قسم کی شاعری کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ گوہر کی قلم نے ایسے موتی بکھیرے ہیں جن کی چمک سیکڑوں اور ہزاروں میں الگ نمایاں دکھائی دیتی ہے، زہے معنی زہے خوبی، عجب گنجے پدید آمد۔

عام لفظ " کشکول" کو افضل گوہر نے جو وقار اور اعتبار بخشا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ سچا اور حقیقی شاعر گرے پڑے اور گھسے پٹے الفاظ کو حسن استعمال سے نئی زندگی بخشتا ہے۔ لفظ " کشکول" کو نئے استعاراتی معنی میں دیکھیں:

لوگ کشکول کے سکّوں کی طرح ہیں گوہر
اس لئے ہر کوئی خیرات میں آجاتا ہے

اوپر درج کئے گئے لفظ "بینائی" والے شعر کا جواب نہیں۔

بینائی مری جا کے پلٹ کر نہیں آئی
کیا دیکھ لیا آنکھ نے منظر سے زیادہ

یہاں لفظ بینائی وسیع تر معنی میں استعمال ہوا ہے سوچتا ہوں یہ شعری معیار ہونا چاہئے قبولیتِ عام کو اگر معیار مانا جائے تو بلا مبالغہ افضل گوہر اس دور کے زبردست

پذیرائی حاصل کرنے والے گنے چنے مقبول ترین شعرا میں سے ایک ہیں۔لفظ ”بینائی" پرافضل گوہر کاایک اور جادو صفت شعر۔

یہاں مٹی کو بینائی فقط اک بار ملتی ہے
میں چاہوں بھی تو کب دُنیا دوبارہ دیکھ سکتا ہوں

لفظ” دیمک“ پر کئی اشعار میرے ذہن میں گونج رہے ہیں۔شکیب جلالی نے پہلی بار دیمک لفظ پر ابدی شعر کہا تھا۔

عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہکار پر
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

اس شعر کے بعد مجھے اس لفظ” دیمک“ پر اگر کسی شاعر کا شعر پسند آیا ہے تو افضل گوہر کا شعر ہے، اس میں دیمک نیا استعارا ہے۔شعر میں بلاغت اللہ تعالی کی دین ہوتی ہے ورنہ عروضی متشاعروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا شعر موزوں نہ کہ سکے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشدہ

افضل گوہر کا” دیمک“ پر شعر دیکھیں۔

اس کھیت کو باہر سے ہرا دیکھ کے خوش ہے
دیمک نے جسے کھایا اندر سے زیادہ

یہاں کھیت ملک قوم کی علامت ہوسکتا ہے اور دیمک دوسری علامت ہے۔یہ شعر تاثر میں شکیب جلالی کے شعر سے شاید بڑھا ہوا ہے۔”برسات“ پر”ابری بارد و من می شوم از یار جدا“امیر خسرو سے لیکر عہد حاضر کے شعرا نے نازک خیالیوں کے انبار لگائے ہیں لیکن مجھے افضل گوہر کا شعر تاثر اور(Originalty) کے اعتبار گوہر یک

دانہ اور نایاب موتی جیسا لگا۔

روز ہی ہم گلے ملتے ہیں اور روتے ہیں
کون سا دکھ ہے جو برسات میں آجاتا ہے

لفظ" جزیرے" پر شعر یا مخمصہ کہیے۔ظفر اقبال نے کریٹ کیا۔وہ شعر ایک دھندلکا تھا اور علامتی شعر،ظفر اقبال کا شعر ناقدوں نے ہاتھوں لیا۔ظفر اقبال کا شعر:

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

اسی لفظ" جزیرہ" کو" افضل گوہر نے نئی معنوی آب و تاب بخشی۔اللہ اللہ یہ شعر آب زر سے لکھ کر دیوار دل پر آویزاں کئے جانے لے لائق ہے۔شعر ہو تو ایسا ہو:

دیکھتا ہوگا سمندر بھی کوئی خواب ضرور
یوں جزیرے جو سرِ آب نکل آتے ہیں

مزید اشعار کی تشریح کئے بغیر میں افضل گوہر راو کے خوبصورت اشعار جنہوں نے میری بصیرت پر قبضہ جمایا ہوا ہوں۔آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

یہ کشتیوں والے تو یونہی خوفزدہ ہیں
دریا کی تو ہر موج کنارے سے جڑی ہے
ہجر میں اتنا خسارہ تو نہیں ہو سکتا
ایک ہی عشق دوبارہ تو نہیں ہو سکتا
کب تلک قید رکھوں آنکھ میں بینائی کو
صرف خوابوں سے گزارا تو نہیں ہو سکتا

توقیر عباس اور ثناء اللہ ظہیر کی شاعری

توقیر عباس کے مشہور اشعار:

ٹھوکر لگی تو صف کی طرح جسم کھل گئے
ایک سمت رکھ دیئے تھے کسی نے لپیٹ کر

کتنا اچھا ہے ناتواں ہونا
پاؤں زنجیر سے نکل آیا

تم نے تو بچھڑنے میں زرا دیر نہیں کی
کچھ دیر تو اٹھتا ہے چراغوں سے دھواں بھی

کسی شاعر کے لئے یہ اعزاز کم نہیں کہ اس کے اشعار اس کی بیاض سے نکل کر آوارہ گردی کرنے لگیں۔ اور ان دور دراز جگہوں تک پہنچ جائیں جن کے بارہ میں ان کے تخلیق کار کے دل میں گماں بھی نہیں گزرا ہوتا۔ ایسے اشعار اپنی بقا کا خود ہی سامان بن جاتے ہیں۔ توقیر عباس کے محولہ بالا اشعار اسی ضمن میں آتے ہیں۔

توقیر عباس غزل گوئی کے علاوہ نظم بھی کہتے ہیں بعض لوگ ان کی نظموں کو غزلوں پر فوقیت دیتے ہیں لیکن میں اس افتراق کے حق میں نہیں۔ البتہ میں نے اپنی بساط کے مطابق اس انتخابی سلسلہ کو جدید تر غزل تک ہی محدود رکھا ہے۔ توقیر عباس کی کئی

عمدہ غزلیں میری نظر سے گزری ہیں، زود گو شاعر ہیں۔ان کا پیندا پتلا بھی نہیں لیکن میرا دستِ کوتاہ ہی اس شاخِ بالا سے ثمر جلد نہ اتار سکا سو اب مختصر سا انتخاب حاضر ہے جو اہلِ ذوق کے لئے کحل بصارت ہوسکتا ہے۔نمونہ اشعار :

وقت کر دے گا فیصلہ اس کا
کون سچا ہے کون جھوٹا ہے

معلوم ہے جس موڑ پہ بچھڑے تھے اسی جا
کچھ ہاتھ ہلاتے ہوئے اشجار کھڑے تھے

ہوا ہے اور ہوا بھی بہت غضب کی ہے
سبھی کو فکر یہاں اب حسب نسب کی ہے

دنیا مجھے ٹوٹے ہوئے بازو کی طرح تھی
جو اپنی ضرورت سے گلے آن پڑی ہے

ہر رکاوٹ کو گرایا بھی نہیں جا سکتا
راستے میں کبھی اولاد بھی آجاتی ہے

میں دے رہا ہوں تمہیں خود سے اختلاف کا حق
یہ اختلاف کا حق ہے مخالفت کا نہیں

ثناء اللہ ظہیر :

ثناء اللہ ظہیر جدید دور کے جدید تر شاعر ہیں انہوں نے نیچے پیش کئے گے ایک

شعر میں از راہِ عجز و انکسار اپنی کم حیثیتی کا اظہار نہیں کیا ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں اس کے پیچھے ایک کہانی ہے جس کے وہ خود مرکزی کردار ہیں۔ شعر:

میرا یہ دکھ کہ میں سکہ ہوں گئے وقتوں کا
تیرا ہو کر بھی ترے کام نہیں آسکتا

ان کے شعر کہنے کا انداز منفرد ہے عام موضوع کو بھی تازہ لہجہ سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ مثلاً ہجر، آئینہ، یاد، شملہ! آئینہ وغیرہ پامال الفاظ پر اشعار کہہ کر انہیں نئی زندگی بخشی ہے۔ ظہیر نہایت سلیقہ شعار شخصیت کے مالک ہیں اور کم گو شاعر ہیں لیکن جب بھی کہتے ہیں عمدہ اشعار کہتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ضروری ہے کارگر یہ بھی
مگر یہ ہجر کے دوران تو نہیں کریں گے

نیند آرہی ہے گھنی چھاؤں دیکھ کر
لیکن ابھی ہے مسافت پڑی ہوئی

میں ہی کروٹ بدلنے لگتا ہوں
آنکھ لگتی ہے جونہی بستر کی

ناراض ہوگیا مرا کوزہ بدست دوست
جب میں نیشکریے میں سمندر نہیں کہا

اچھے دنوں میں سب ہی مرے ساتھ تھے ظہیر
یادوں کے اس محاذ پہ تنہا کھڑا ہوں میں

خود بھی کچھ کم نہیں میں اپنی تباہی کے لئے
دوستوں سے مجھے امداد بھی آجاتی ہے

مختلف موضوعات پر گلدستہ اشعار:

رستے کی رکاوٹ تو نہیں ہے مرا ہونا
میں خود تو نہیں ہوں مرا سایہ ہے سڑک پر

میں اس دکاں سے راہ بدل کر نکل گیا
جس میں تھی میرے گھر کی ضرورت پڑی ہوئی

میں بڑا ہوں تو بڑا مان لیا جاوں گا
پہلے پہلے بہت آسان لیا جاوں گا

یوں بھی دشوار ہے پہچان بنانے کا عمل
اور یہ ڈر بھی کہ پہچان لیا جاوں گا

لوگ دیکھیں گے ترے دل سے نکلنا میرا
دیوتا ہو کے میں پتھر سے نکل آیا ہوں

رونا ہوتا ہے کسی اور حوالے سے مجھے
اور ایسے میں تری یاد بھی آجاتی ہے

تو ملا ہے کہ گئی عمر پلٹ آئی ہے
کتنا لڑکا سا میں اندر سے نکل آیا ہوں

ترا چہرہ روزانہ دیکھتا ہوں
مری آنکھوں کا خرچہ چل رہا ہے

تمہارے وصف کاتے جا رہے ہیں
مرے جزبوں کا چرخہ چل رہا ہے

ترے مکاں کا تقدس عزیز تھا اتنا
میں آرہا ہوں گلی سے پرے اتار کے پاؤں

بلندیوں پہ چٹانوں کو روندتا پانی
ندی میں گر کے پکڑ لے گا کوہسار کے پاؤں

اب اس طرح بھی نہ گھٹ گھٹ کے طاقچے میں رہو
چراغ ہو تو مرے ساتھ راستے میں رہو

اختر عثمان کی شاعری

اس اہتمام سے پیکر تراشتا ہوں
گمان گزرے کہ جیسے بنا بنایا ہے

اک لفظ جس کی لو میں دمکتا رہے دماغ
اک شعر جسکی گونج کہیں پیشتر نہ ہو

اختر عثمان نہ صرف اچھے شاعر ہیں، بلکہ انتقادی صلاحیتوں کے مالک، اور کئی زبانوں کے عالم اور ریڈر بھی ہیں یہاں ہم ان کی غزل کے متعلق ہی بات کریں گے۔انہوں نے نئی شاعری کے حوالے سے اہم نکات بھی بتائے ہیں مثلاً ''بڑا ادیب ہر زمانے لئے بڑا ہوتا ہے۔ ۱۹۸۹ء کے بعد کی نسلیں نظریاتی طور بے سمتی کا شکار ہیں اور شاعری برائے شعر گفتن ٹٹوں کے حساب سے ہو رہی ہے۔''

مزید ''ادب رنگ'' میں شایع انٹرویو میں انہوں نے بڑی پتے ہی باتیں کی ہیں ۔بے شک بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ نکھرتا چلا جائے. بڑے ادب کے نتائج اور اس کا تخلیقی منہج ہر زمانے میں ویلڈ valid رہتا ہے۔

''بڑا ادیب وہ ہے چاہے وہ کسی بھی زبان میں ہو کس کا اکثر و
بیشتر حصہ ہر زمانے میں اکثر و بیشتر لوگوں سے مخاطب ہونے
کی صلاحیت رکھتا ہے گویا مستقبل سے بھی مکالمے کی

صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی پیشکاری یوں کی جاتی ہے کہ وہ
پرانی نسل سے، نئی نسل اور آنے والی نسلوں سے مکالمہ کرتا
ہے بڑا ادب کا ایڈیم عام ادب سے مختلف ہوتا ہے۔''

اردو کی شاعری کے فرسودہ رجحان Trend کو ہندوستانی تہذیب سے منقطع اور غیر متصل دیکھ کر بہت پہلے، انگریزی اردو کی پہلی تاریخ ادب کے مصنف بابو رام سکسینہ نے کئی اعراضات کئے تھے۔ مثلاً اردو کی تشبیہات گل و لالہ، گل و بلبل سب ایرانی یا فارسی شاعری سے مستعار ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دیر تک اردو شعراء نے اوریجنل ادیب کریٹ کرنے کی سعی ہی نہیں کی۔ بلکہ وہ فرسودہ اور گھسے پٹے موضوعات استعارے دہراتے چلے آئے ہیں۔

پچھلے سالوں سے میں نے دیکھا ہے اگر ایک شاعر ''چاک'' پر شعر کہتا ہے تو ٹیڈ پول (Tadpole) شاعروں کی ایک بڑی جماعت اپنے اپنے ڈھنگ سے موضوع ''چاک'' پر مزبلہ کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ ایسی شاعری trash کی حیثیت رکھتی ہے۔

اچھے بھلے کھاتے شعرا ہجر و فراق کے ناٹک کرنے لگتے ہیں۔ داغ اسکول کے لاتعداد شعرا آج بھی وہی پامال اور پس خوردہ مضامین دہرا رہے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے اختر عثمان کی اپنی شاعری میں کتنا دم ہے۔ اختر عثمان کے اشعار دیکھیں:

یہ کارِ عشق بھی ہے عجب کارِ ناتمام
سمجھیں کہ ہو رہا ہے مگر عمر بھر نہ ہو

دونوں طرف کا شور برابر سنائی دے
دونوں طرف کسی کو کسی کی خبر نہ ہو

اک دشتِ بے دلی میں لہو بولنے لگے
ایسے میں ایک خواب کہ تُو ہو،مگر نہ ہو

یہ تینوں اشعار لاجواب ہیں ۔ان کی شاعری میں کلاسیکیت کا رچاو بطریق عمدہ ہوا ہے ۔مجھے تو وہ فارسی کی شعری روایت کے سخت متاثر دکھائی دیتے ہیں ۔مجھے ان کی غزل پر ایک اعتراض ہے وہ کہ اس میں زیادہ تر اکہری پرت ہی ملتی ہے البتہ امیجز انہوں نے اپنے ماحول سے مستعار لئے ہیں ان کی شاعری میں پایا جانے والا یہ عنصر انہیں بیشتر معاصرین سے ممتاز کرتا ہے ۔شعر دیکھیں:

توے کے تارے پلک جھپکتے ہی بجھ گئے ہیں
فلک پہ اختر کو جاں کے لالے پڑے ہوئے ہیں

اس شعر میں ''توے کا تارے'' کے حسن استعمال کا جواب نہیں ۔غزل

کپاس دھنکی گئی ہے گالے پڑے ہوئے ہیں
شہید بچے علم سنبھالے پڑے ہوئے ہیں

میں اپنی پہچان بھی عجائب گھروں میں دیکھوں
عدو کے گھر میں مرے حوالے پڑے ہوئے ہیں

جنہوں نے لمحوں سے شرط باندھی تھی دوڑنے کی
شجر نے نیچے پڑاؤ ڈالے پڑے ہوئے ہیں

نگر میں صحرا نورد سایہ سا گشت میں ہے
اسی لئے تو گھروں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں

نظر کے چولہے کو ناخنوں سے کریدتا ہوں
مجھے یقیں ہے کہیں اجالے پڑے ہوئے ہیں

یہاں تو لکھے ورق پہ کورے کو برتری ہے
زمیں پہ کتنے حروف کالے پڑے ہوئے ہیں

توے کے تارے پلک جھپکتے ہیں بجھ گئے ہیں
فلک پہ اختر کو جاں لے لالے پڑے ہوئے ہیں

اکثر و بیشتر اختر عثمان روزمرہ کے معمالات کو شاعری میں باندھتے ہیں میرے خیال میں یہ جدید تر شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔شعر

رات ڈھلنے کو ہے اور آخری گاڑھی والا
مجھ سے کہتا ہے کہ تجھ کو بھی کہیں جانا ہے؟

انہوں نے اعتدال کی راہ کی بات نرالے ڈھنگ سے کی ہے دراصل محبت ہی بے اعتدالیوں کا سبب بنتی ہے۔لازوال شعر ہے یہ:

دل و دماغ سے اُس کا خیال اگر نکلے
یہی ہے ایک رہ اعتدال ، اگر نکلے
تجھے بھولے کوئی ہموار دماغ
تیرے پامال کہاں بھولتے ہیں

کشیدِ جاں سے غزل پُراثر بناتا ہوں
میں اپنا وار بہت کارگر بناتا ہوں

ترا خمیر اٹھاتا ہوں اپنے ملبے سے
تجھے بناؤں تو پھر ٹوٹ کر بناتا ہوں

عجیب شوق ہے اختر یہ اہلِ ساحل کو
وہ ایستادہ رہیں، ہم گہر اگلتے جائیں

اوپر دی دی گئی مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اختر عثمان کلاسیک کو جدید تر حسیت سے روشناش کرنے اور شاعری میں امیجز اپنی ہی تہذیب سے لینے کی راہ ہموار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو شاعری میں اضافہ کیا ہے اور وہ یہ شغل جاری رکھے ہوئے ہیں۔

کاشف حسین غائر کی شاعری

اپنی ہی چھاوں میں بیٹھا غائر
اپنی ہی دھوپ نکالی میں نے

کاشف حسین غائر کی ایک سے ایک غزل سادگی میں بڑھی ہوئی ہے ان کے ہاں موضوعات کا تنوع اور لہجے کی ندرت کی مثالیں بہت مل جاتی ہیں ۔’’ آنسوں میں دھوپ اور شام کی تیرگی ملانا‘‘ کم ازکم میرے لئے نیا ہے ۔شاعر کے لئے ضروی ہے جب وہ کچھ لکھے تو نیا لکھے ۔ پرانی چیزیں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ۔سچ کہوں تو کعب بن زہیر کا مقولہ ہو یا زہیر بن سلمی کا یا کسی اور کا ارشاد ہو ۔ یہ سچ ہے کہ صدیوں تک روایت پسندوں اور کلاسیکی شعرا کا یہی مقولہ تکیہ کلام بھی رہا ہے ۔یعنی’’ جو بھی ہم کہتے ہیں یا تو وہ ہم دوسروں سے لیتے ہیں یا اپنے ہی کہے کو دہراتے ہیں ۔‘‘

ہم اس بات یا مفروضہ کی سختی سے تردید کرتے ہیں ۔اصل الفاظ مقولہ کے یہ ہیں ۔جدید تر شعرا کو یہ مقولہ اپنے ذہنوں سے نکالنا ہوگا۔ دراصل یہ جملہ مدح گوئی کے ذیل میں آتا ہے اس لئے قابل اعتماد نہیں ۔اس قول کا متن یہ ہے ۔

’’ما اُرانا نقول اِلا رجیعاً
اَو معادا من قولنا مکرورا‘‘
(کعب بن زہیر)

تو میں بات کر رہا تھا کاشف حسین غائر کی شاعری میں جدت اور بداعت کی سہل نگاری کی۔ایک شعر دیکھئے:

جو اشک بچ گئے انھیں لاتا ہوں کام میں
تھوڑی سی دھوپ روز ملاتا ہوں شام میں

ان کے اشعار میں زندگی کا تموج اور حرارت بھی دکھائی دیتی ہے..ان کی دیوانگی اور وحشت نامعلوم صحرا میں دھول اڑاتی ہے... لہجہ دلکش ہے۔

کاشف حسین دشت میں جتنے بھی دن رہا
بیٹھا نہیں غبار مرے احترام میں

نظر نظارہ اور ستارے.....موزوں الفاظ کا انتخاب ان کے اکثر اشعار کو پر لطف بنا دیتا ہے۔معانی اکہرے بھی ہوں تو کیا؟ ان کے شعر لطف و سرور تو دیتے ہیں۔اس دور میں ایسی شاعری بھی غنیمت ہے۔کچھ اشعار جو مجھے اچھے لگتے ہیں آپ بھی ملاحظہ کریں۔

نظر ملی تو نظاروں میں بانٹ دی میں نے
یہ روشنی بھی ستاروں میں بانٹ دی میں نے

فراغتوں کو بھی مصروفِ کار لایا ہوں
بہار آئی نہیں ہے، بہار لایا ہوں

اوپر دیے گئے تمام اشعار سہل ممتنع کی مثالیں ہیں اور کاشف حسین غائر کی یہ خوبی قابل داد ہے کہ وہ گنجلک تراکیب اور مشکل پسندی سے گریز کرتے ہیں مجھے تو ان کے اشعار ساون کی ہلکی پھوار جیسے خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔اور قارئین کے دلوں میں آسانی سے دلوں میں اتر جاتے ہیں یہ میرا ذاتی تاثر ہے۔شعروں میں غنائیت اور

موسیقی کا عنصر اوج پر معلوم ہوتا ہے۔ایک غزل کے تین اشعار جو کہ ان کی کریفٹ کے نمونے ہیں کو آپ بھی ملاحظہ کریں:

دروازے کو دستک زندہ رکھتی ہے
جیسے دل کو دھک دھک زندہ رکھتی ہے

جیسے ہی چپ ہوتے ہیں، مر جاتے ہیں
کچھ لوگوں کو بک بک زندہ رکھتی ہے

آخر میں کاشف حسین غائر کے اسلوب کے عمدہ نمونے کے طور پر دو اشعار جو مجھے بہت پسند ہیں پیش کرتا ہوں.. اشعار لاجواب ہیں۔

میں جو آزاد ہوں کسے معلوم
قید اپنے پروں میں رہتا ہوں

میرے اندر کے شور نے غائر
کیسا خاموش کر دیا ہے مجھے

ضیاء المصطفیٰ ترک کی شاعری

سکوت ٹوٹے نہیں آئینے تہی ہو جائیں
یہ لحن ملتا ہے جب لفظ ملتوی ہو جائیں

سکوت سے بھی سخن کو نکال لاتا ہوا
یہ میں ہوں لوح شکستہ سے لفظ اٹھاتا ہوا

ضیاء المصطفیٰ ترک کے یہ شعر پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اور کہا بھی گیا ہے کہ اگر مصوری کے پاس رنگوں کی کثرت ہے اور موسیقی کے پاس سُروں کے بہتے دریا ہیں جو ہماری سماعتوں کے نہاں خانوں کو سیراب کرتے رہتے ہیں تو شاعری کے پاس ایسے لاکھوں من موہنے والے الفاظ ہیں جنہیں شاعر خام مواد کی طرح استعمال کر کے لاکھوں خوبصورت اشعار یا ''ابیات'' (جس کے معنی عربی میں گھروں کے ہوتے ہیں) یعنی خیالی شیش محلات کھڑے کرتا ہے۔ ان محلات کے کھڑے کرنے کے پیچھے شاعر کا وجدان اور بصیرت کارفرما ہوتی ہے۔ ورنہ الفاظ تو خشت ہائے بے حس یا بے جان سنگ پارے ہوتے ہیں۔

یہ خیالی شیش محلات الفاظ سے تیار کئے جاتے ہیں یہ شیش محلات وقت کی ریت پر طمطراق سے صدیوں تک کھڑے رہتے ہیں۔ شاعری صوری صوتی اور معنوی

امکانات کے نئے در وا کرتی ہے شاعر کا منصب بڑا ہوتا ہے جو چیزوں کو الگ ڈھنگ اور لاتعداد زاویوں سے دیکھتا ہے یہی شاعری اور سائنس میں فرق ہے شاعری فکشن کے قریب ہے اور مادی دنیا سے بہت دور۔شاعر کے ہاں تخیل شہد مکھیوں کی طرح بھنبھناتا ہیاورنت نئی وادیوں سے چاشنی کا رس Nector لاتا ہے ذہن کے خلیوں میں یہ شعری شہد بنتا ہے۔ یہ وجدانی خوان! انسانی ذہن کے دستر خوانوں پر پروسا جاتا ہے۔اس کے کھانے والے اس غزا سے قوتِ دانائی حاصل کرتے یہ حقیقی شاعر کا منصب ہے اور شعر کا مفہوم ہے۔فردوسی نے کہا تھا۔

شنیدم زدانا کہ دانا بسیست
ولیکن پراگندہ با ہر کسیست

یہ دانائی بھی گویا دشت دشت بکھری ہوئی ریت کے ذروں سے ملے ہوئے فلزات ہیں میں سمجھتا ہوں جنہیں مشیت ایزدی نے کسی مصلحت کے تحت ریگ در ریگ مغشوش کر دیا ہے انہیں الگ کرنا ہی دنیا کی سعادت مندی ہے۔۔یہ کام کیمیا گروں کا ہے یہاں کیمیا گروں سے میری مراد شعرا ہیں اور ان کے کلام کو سمجھنے والے نقد گر یا ناقدین کی جماعت ہے۔جو قاری اور شاعر کے درمیان کی خلیج یا کھاڑی پر ترسیلی پُل بناتے ہیں۔

افہام وتفہیم کے تمام منقطع راستے بحال کرتے ہیں۔یہ لوگ حقیقی شعراءصلح کل بھی ہوتے ہیں۔شعر فہمی ہوا افہام وتفہیم اس کے لئے سکوت شرط ہے۔اوپر والے شعر میں ”آئنوں کا تہی ہونا“ خوارج سے کٹ جانے کا استعارہ ہے یعنی انہماک کی طرف اشارہ ہے یعنی خارجی دنیا سے کٹ کر دھیان کی سیڑھیوں سے اس لحن کے خفیہ در تک پہنچا جا سکتا ہے۔”لحن“ معنوی اعتبار اور لہجے کے اعتبار سے کسقدر رسجرا اور تازہ پھول ہے جو

شاخ معنی کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہا ہے۔

حرف نگفتہ بیچ میں حائل ہے کب سے
باب سخن میں خاموشی تقریظ کروں

ایسے شعر کو اگر پڑھ کر بھلا دیا جائے تو بھی اسکی حلاوت اور تاثیر دل و دماغ سے تادیر نہیں جاتی۔جس طرح عطر کی خالی شیشی اٹھا کر سونگھنے پر اس میں کسی خوشبو کے ہونے کا احساس دلا دیتی ہے یہی صورت اور ایسا ہی معاملہ شعر کا بھی ہے۔شعر پڑھ کر ہم بھلا دیتے ہیں لیکن ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بعد بھی اس کا اثر کہیں نہ کہیں کسی ذہنی خلیے سے مکہتا رہتا ہے۔مجھے تو اشعر wisdom یعنی دانائی کا حصہ لگتا ہے۔مخبر صادق علیہ السلام نے کہا بھی ہے۔حدیث "اِن من البیان لسحرا ،واِن من الشعر لحکمة"

بہت سے شعری بیانات یا اظہار جادوئی اثر رکھتے ہیں اور اسی قبیل کے دوسرے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔۔۔حکمت تو ہماری ایسیوں کی گمشدہ چیز ہے حکمت روشنی ہے۔

روشنی نہ ہوتی تو یہ کائنات عدم ہی ہوتی یا کالعدم.....روشنی نے ہی اسے عدم سے باہر نکال کر کر کے ہمیں اسکے وجود کا احساس دلایا ہے۔ضیاء المصطفیٰ ترک نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :شعر

چراغ جلتے ہی اک شہر منکشف ہم پر
اور اس کے بعد وہی شہر ڈوب جاتا ہوا

پکارا ہے کچھ ایسے نام میرا
رگوں میں روشنی سی بہہ رہی ہے

روشنی کا منصب ہر طرح کی تنگی و تاریکی کو دور کرنا ہے یہ الہامی شعر ملاحظہ کریں:

مکاں کی تنگی و تاریکی بیشتر تھی سو میں
دیے جلاتا ہوا آئینے بناتا ہوا

فاصلے دیوار اٹھانے دے کم ہو سکتے بشرطیکہ سفر اوپر کی جانب یعنی کسی بلندی کی طرف ہو یہاں دیوار کا روایتی معنی یکسر بدل دیا ہے۔ دیوار تو رکاوٹ ہوتی ہے لیکن یہاں دیوار سیڑھی کا تصور پیش کرتی ہے یا بلندی تک رسائی کا ذریعہ۔ شعر دیکھیں:

میرے گریہ سے نہ آزار اٹھانے سے ہوا
فاصلہ طے نئی دیوار اٹھانے سے ہوا

شاعری محبت کی زبان ہے اس سے انسانوں کا درد مشترک سمجھ آتا ہے۔ حقیقی شاعری موسیقی کی طرح آفاقی اقدار یا جذبات کی ترجمانی کرتی ہے. نیچے دئے گئے اشعار میں جذبات کی صداقت دیکھیں :

کسی سفر کسی اسباب سے علاقہ نہیں
تمہارے بعد کسی خواب سے علاقہ نہیں

میں اس کی چھاؤں میں ہوں ترک لیکن
وہ میری دھوپ کیسے سہہ رہی ہے

حسین مجروح: اردو غزل میں نئے تجربات اور تغیر ہئیت کا معاملہ

حسین مجروح کے دو اشعار:

وہ قحطِ مخلصی ہے کہ یاروں کی بزم سے
غیبت نکال دیں تو فقط خامشی بچے

جو منہ کو آرہی تھی وہ لپٹی ہے پاؤں سے
بارش کے بعد خاک کی سیرت بدل گئی

حسین مجروح کے یہاں جولسانی توڑ کے تجربے ہو رہے ہیں۔ مثلاً نئے نئے قوافی، الفاظ کی تراش خراش وغیرہ ٹریٹمنت کی کمی اور غرابت کی وجہ سے غیر مانوس لگتے ہیں اور ایسے اشعار میں شعریت غائب اور متخلف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ غزل کے مزاج اور ڈھانچے کو بدل کر اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتے ہیں چاہتے ہیں یا پھر کسی اور وجہ سے اس کے خدوخال کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں لیکن غزل کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ صنف غزل ایسی تبدیلیوں کی پوری طرح قبول نہیں کرتی بلکہ اپنے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنیوالوں قعرِ فراموشی میں پٹخ دیتی ہے۔ حسین مجروح کے اشعار دیکھیں:

دیکھا جو اُس کے بھیگے بدن کی تراش کو
مچلی بہت یہ آنکھ وہاں بود و باش کو

ناتے سبھی ہیں سانس کی ڈوری سے اس لیے
دریا قبولتا نہیں مچھلی کی لاش کو

حسین مجروح کے کلام میں خارجی جواہر پارے نظر آتے ہیں۔

ز فرق تا قدَمَش ہر کجا کہ می نگرَم
کرشمہ دامن دل می کشَد کہ جا اینجاست

تاش اور قاش اسی طرح محسوستا، قبولتا، آوازتا، خلیجنا وغیرہ نے غزل کو ناقابل حد تک ذوق سلیم/ ناگونڈ بنادیا ہے۔ یہاں نیچے دیے گئے اشعار واقعاتی پیرائے میں لکھے گئے ہیں لیکن چاشنی سے محروم ہیں۔

سرِ بدن سے کب کھلیں چاہت کے بھید اس لیے
ہوتا ہے نو بیاہتا جوڑے کا ناشتہ الگ

سمتوں میں تھیں جدا جدا ایک ہی گھر کی سیڑھیاں
حجلہ زوجگی سے تھا زینہء داشتہ الگ

مذکورہ بالا اشعار کسی طرح بھی دامن دل کو نہیں جھنجھوڑتے اور تاثیر یا اثر پذیری سے خالی ہیں۔ یاد رہے ان کے یہاں محض یا بستگی اور خشک مزاجی کے سوکچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ہم غزل کی ساخت کو بالکل منہدم کر کے اس کے ملبہ پر کوئی نیا ڈھانچہ نہیں تعمیر کر سکتے ہیں۔ البتہ اس قسم کے نئے تجرباتی سلسلہ کے دوران بعض اشعار اچھے بھی نکل آتے ہیں۔

وہ قحطِ مخلصی ہے کہ یاروں کی بزم سے
غیبت نکال دیں تو فقط خامشی بچے

جو منہ کو آرہی تھی وہ لپٹی ہے پاوں سے
بارش کے بعد خاک کی سیرت بدل گئی

حسین مجروح کی پابند نظموں میں سے بھی بعض غزل کے اشعار مل جاتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ بیمار کی شفا کے لئے
بدن کی شاخ سے، سر کاٹنا ضروری ہے

تن سوال طلب ، بے کسوں کی آہوں سے
برہنہ غم کی طرح ڈھانپنا ضروری ہے

خواب، امید کی توفیق سے بڑھ سکتا ہے
اور نیا دن تو کسی وقت بھی چڑھ سکتا ہے

ذوالفقار عادل : ''شرق مرے شمال میں''
ایک مطالعہ

سوچا یہ تھا وقت ملا تو ٹوٹی چیزیں جوڑیں گے
اب کونے میں ڈھیر لگا ہے باقی کمرہ خالی ہے

ہر حسرت پر ایک گرہ سی پڑ جاتی تھی سینے میں
رفتہ رفتہ سب نے مل کر دل سی شکل بنا لی ہے

ذولفقار عادل کہیں کہیں اپنے تجربات ومشاہدات کو جاندار شعری پیکروں میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور قسم کے شعروں سے ان کے مافی الضمی کا پتہ چلتا ہے۔شعر

جتنا ان سے بھاگ رہا ہوں اتنا پیچھے آتی ہیں
اک صدا جاروب کشی کی، اک آواز بھکاری کی

ایک اور شعر دیکھیں سہو ونسیان کی بیماری اس دور میں کچھ زیادہ ہی عام ہوتی جارہی ہے، غالباً ایک تجربہ کی بنیاد پر ایسا کہا گیا ہے۔شعر

اپنے آپ کو گالی دے کر گھور رہا ہوں تالے کو
الماری میں بھول گیا ہوں چابی الماری کی

ذوالفقار عادل کا لب ولہجہ کھردرا ہے اور کرخت جیسا اس میں روایتی غزل کی ملائمت محسوس نہیں ہوتی شاید یہ دوسرا طرز ہے۔ایک شعر

یہ آدمی مری نظروں میں پست کیسے ہوا
کیسے بتاوں میں سگ پرست کیسے ہوا

کہیں کہیں اس قسم کے اشعار میں قافیہ پیمائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔اور قاری کی تمامتر توجہ قافیوں سے ہٹاتے ہوئے بھی نہیں ہٹتی۔میرے خیال میں بیشتر حصہ شاعری ایسی ہی ملی جلی کیفیت کا حامل ہے۔''شرق میرے شمال میں'' میں گنتی کے اشعار دامن دل کو جھنجھوڑتے بھی ہیں۔ذوالفقار عادل کے بعض اشعار داستانوی اور افسانوی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور دلچسپی سے خالی نہیں۔اشعار :

قبرستان کے اک کونے پر گورکنوں کا گھر
موت انہیں زندہ رکھتی ہے مٹی ان کا زر

شناور اسحاق کی شاعری

ہمارے خواب شکستہ ظروف کے مانند
حویلیوں کے عقب میں پڑے ہوئے ہیں یہاں

یہاں اس شعر میں ٹوٹے ہوئے ظروف خوابوں کا استعارہ کیا ہے۔

میں آ رہا ہوں ابھی چوم کر بدن اس کا
سنا تھا آگ پہ بوسہ رقم نہیں ہوتا

اس شعر میں حسی و لمسی پیکر دلچسپ ہے۔

مرے سجدوں میں اب اعداد ہیں اسما نہیں ہیں
مرا داغِ جبیں دینار جیسا ہو گیا ہے

داغ جبیں کو دینار سے تشبیہ ... ریاکاریوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔

پرو جاتا ہے کوئی دستِ بے آواز ہر شب،
مری تسبیح میں گندم کے دانے بادشاہا

دست بے آواز کا گندم کے دانے پرونا نہایت خوبصورت شعر ہے، میں اس کی بداعت اور بکارت کا کوئی جواب نہیں۔

سورج ڈوب چکا ہے اور میں ایک چراغ میں زندہ ہوں
جسم کی راکھ پہ بیٹھا ہوں، اب صرف دماغ میں زندہ ہوں

یہاں سورج کو جوانی کا استعارہ کیا ہے اور راکھ کو بڑھاپے کا نہایت خوبصورت شعر ہے۔شاور اسحاق کے کچھ اشعار بہت ہی اچھے ہیں جدت طرازی کے چکر کئی اشعار لفظوں کے طومار اور پلندے بن کر رہ گئے ہیں۔مگر یہ کیا کم اسی ریگزار میں سے کوئی کوئی درنایاب بھی مل جاتا ہے۔حمدیہ کلام ملاحظ کریں:

بنیں گے کن صحیفوں کے فسانے بادشاہا
یہ میرے رائگاں ہوتے زمانے بادشاہا

اب وہ نسل بھی معدوم ہوئی جاتی ہے
جو بتاتی تھی فسادات سے پہلے کیا تھا

رات آئی تو ایک الاو سورج کا ہمزاد بنا
قحط پڑا تو ہم جیسے بے مایا بھی اوتار ہوئے

شاور اسحاق کے بعض اشعار میں حکیمانہ نکات اور تہ داری سوچنے پر مجبور کرتی ہے ۔جبکہ اس دور میں سطحی اور رواں شاعری کا چلن ہے کیونکہ یہ جذبات کو انگیخت کرتی ہے۔اور عام قاری کو جزوقتی سرور یا راحت جیسی پہنچاتی ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ حد سے زیادہ روتے ہوئے بچے کو افیون یا کوئی خواب آور چیز کھلا پلا دی جاتی ہے۔لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں حقیقی شعر اور ہی چیز ہے۔یہ شاعری لطافت خیال ندرت بیاں کے علاوہ انسانی فکر وشعور کو منور کرتی ہے اور گزرے ہوئے وقت کے ساتھ مرتی نہیں بلکہ ہر عہد میں بھی تازہ محسوس ہوتی ہے۔

وہ بولتا رہا جب تک فقط دکھائی دیا
مگر خموش ہوا تو مجھے سنائی دیا

مرے آہو مرے اندر بدکتے پھر رہے ہیں
کوئی جنگل ہے جو بازار تک آیا ہوا ہے

شاور اسحاق نے لفظ ''طوق'' کو پیچیدہ انداز میں برتا ہے، جو نارسائی کی کیفیت کا استعارہ ہے۔ اشعار دیکھیں :

سمندر اب گلے میں طوق سا لگنے لگا ہے
سفینہ ساز اندر سے کنارہ کر چکے ہیں

بعض اشعار انسانی دل و دماغ میں ہلچل مچا دیتے ہیں اور ایسے میں انسان علائق سے کٹ کر شعری پس منظر میں کھو جاتا ہے ایسا کیوں نہ ہو شاعری بھی تو ایک قسم کی ساحری ہے۔ ایک غزل سے دو اشعار:

ابھی سنہرا پہاڑیوں سے بہت پرے ہے
میں اپنے حصے کی چاندنی میں نہا رہا ہوں

جواد شیخ : حقیقی کیفیتوں کا سچا شاعر

جواد شیخ کا تعلق Oral Poetry یعنی شفاہی روایت شاعری سے ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر کے فن سے متعلق اہم ترین نکتہ یوں بیان کیا ہے " میر لکھنے سے زیادہ کہنے کے قائل ہیں ORAL روایت کے امین تھے" مثال

گرچہ کب دیکھتے ہو/ پر دیکھو
آرزو ہے/ کہ تم ادھر دیکھو
گلی میں اس کی گیا/ سو گیا/ نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکارا میر

میں پہلے کہہ چکا ہوں دوبارہ دہراتا ہوں کہ جواد شیخ انسانی دل و دماغ پر طاری ہونے والی کیفیتوں کا شاعر ہے۔اور ان کی شاعری میر کی روایت کی توسیع ہے اور ارد ادب کے ذخیرہ میں اضافہ کی حیثیت ہو سکتی ہے۔جواد شیخ کے تین اشعار:

بات ہم نے سنی ہوئی سنی تھی
کام اس نے کئے ہوئے کئے تھے

میں کہیں جا نہیں رہا لیکن
آپ کیا میرے ساتھ آئیں گے؟

مذکورہ بالا تینوں اشعار زندگی کے سفر کی رائگانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ملولی کیفیت یعنی خستگی اور کسالت سے بچنا محال ہے ۔بس اس سے بچنے کا ایک ہی علاج ہے، وہ یہ خود کو مشغول رکھا جائے ۔جواد اس کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

ڈرتا بھی ہوں کہ ہو ہی نہ جائے کہیں وہ کام
اک عمر سے ہوں جس میں برابر لگا ہوا

لیکن زندگی میں طمانیت اور سکون کیسے ملے؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں، قدرت کی رحمت کی طرح انسان کی تمناؤں کا سلسلہ بھی بے پایاں ہے ۔شعر:

کوئی جواب نہیں ہے تری سخاوت کا
مگر سوال مری اشتہا کا ہوتا ہے

کوئی کھڑکی کھلے گی رات گئے
کئی اپنی مراد پائیں گے

یہاں اس شعر میں لفظ کھڑکی علامت ہے ۔کیونکہ رات کے اندھیرے میں اصطلاحی کھڑکی کھلنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ۔اس شعر کو یوں سمجھا جاسکتا ہے ۔

رات طالب علم، عاشق، چور اور عابد کے لئے بہت قیمتی اور معنی خیز ہوتی ہے طالب علم اس کے دوران اس کے سینے کے اندر اتر کر علم کے موتی سمیٹتا ہے عاشق اس اوٹ میں چھپ کر عشق کی لذت اٹھاتا ہے چور کو اندھیر میں ہی نقب زنی اور شب خونی مارنے کا موقع ملتا ہے ۔بے ریا عابد بھی اندھیرے کے پردہ میں مالکِ حقیقی کی خوشنودی کے جتن کرتا ہے ۔معلوم ہوا کہ کھڑکی نہایت عمدہ علامت ہے ۔

جواد زندگی کی طرح تھی کوئی سڑک
دونوں طرف قطار میں کیکر لگا ہوا

یہاں اس شعر میں سڑک زندگی کا استعارہ ہے۔لیکن اس کے دونوں طرف .....قطار در قطار کیکر ہیں ۔کیکر رنج اور دکھ کا استعارہ ہے۔ یاد رہے کیکر ایسا پیڑ ہے نہ تو اس کی چھاؤں میں کوئی بیٹھتا اور نہ ہی اس (خاردار پیڑ) کے قریب ہی کوئی جاتا ہے زندگی سڑک کی مانند ہے۔جس زندگی کا کوئی لائحہ عمل نہیں منزل مقصود نہیں وہ سراپا رنج ہوتی ہے۔ یہ شعر ایک دم نہیں کھلتا. پر لطف شعر ہے۔مزید چند خوبصورت اشعار:

دل بتاتا ہے مجھے عقل کی باتیں کیا کیا
بندہ پوچھے کہ ترا ہے کوئی لینا دینا

میں کسی طرح بھی سمجھوتہ نہیں کر سکتا
یا تو سب کچھ ہی مجھے چاہیے یا کچھ بھی نہیں

لیکن تمھارا حسن تمھارا ہی حسن ہے
اپنی طرف سے میں نے بڑی احتیاط کی

کوئی نہیں کہ جس پہ کیا جائے اعتبار
میں اپنی بات کر رہا ہوں آپ کی نہیں
اور یہ اک طرح کا ہم ایسوں پہ احسان ہے
دیکھنے والی شے لوگ اکثر نہیں دیکھتے

مگر ہم مُصر تھے کہ ہم نے کتابیں بہت پڑھ رکھی ہیں
بڑوں نے کہا بھی کہ دیکھو میاں تجربہ تجربہ ہے

اب مرا دھیان کہیں اور چلا جاتا ہے
اب کوئی فلم مکمّل نہیں دیکھی جاتی

ہم بھی کیسے ایک ہی شخص کے ہو کر رہ جائیں؟؟
وہ بھی صرف ہمارا کیسے ہو سکتا ہے؟؟

طرز غالب کا نمایاں پہلو "مشکل گویم و گرنہ مشکل گویم تھا" یہ مشکل پسندی محض فارسی زدگی یعنی کثرتِ فارسی تراکیب اور ثقیل الفاظ کے باعث ہی نہیں بلکہ صنعت کنایہ اور استعارہ کی کثرت نیغالب کی تفہیم مزید دشوار کر دی ۔لیکن غالب کا معیار بھی انہیں صنایع و بدایع سے بلند ہے بدیع گوئی جسے ایجاد و ابداع کہا جاتا ہے غالب نے سخن گوئی ان بلندیوں پر پہنچا دیا جہاں پہنچنے کا تصور بھی محال ہے نشتریت و ایمائیت بھی کلام غالب کا خاصہ ہے۔ یہ خوبیاں ریختہ کے اول استاد میر کے یہاں کم ملتی ہیں لیکن نایاب نہیں ۔لیکن میر کا مقام ان کے پیچد اراسلوب اور اثر پزیری کی وجہہ سے ہے۔ مجھے میر کے پیچد اراسلوب اور ویسی ہی اثر پزیری جواد شیخ کے یہاں دکھائی دیتی ہیں۔

جواد شیخ کے کلام کی منفرد خوبی یہ کہ ان کی غزل میں عصری کیفیتوں کا اصلی پن کے ساتھ بکثرت اظہار ہوا ہے۔ان کی شاعری میں تکلف و تصنع کا عیب بالکل نہیں پایا جاتا۔ایسی روانی اور سلاست جو مرزا دم خان کے علاوہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ان کے یہاں پایہ کمال کو پہنچتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ شعر دیکھیں کس قدر سچا ہے :

ہم بھی کیسے ایک ہی شخص کے ہو کر رہ جائیں؟؟
وہ بھی صرف ہمارا کیسے ہو سکتا ہے؟؟

یہ شعر دیکھیں ایسی کیفیت سے تقریباً ہر حساس آدمی اپنی زندگی میں دوچار ہوتا

ہے۔کیا حقیقی شاعری ہے یہ۔

تم سے ناراض تو میں اور کسی بات پہ ہوں
تم مگر اور کسی وجہ سے شرمندہ ہو

ایک ناکام عاشق جس کے سامنے بیکران صحرا ہوں اس کی کیفیت۔

اپنے سامان کو باندھے ہوے اس سوچ میں ہوں
جو کہیں کے نہیں رہتے وہ کہاں جاتے ہیں

کسی کو اپنے اندر راستہ دینا اور خاک اڑوانا..... ایک نیا تجربہ ہے لیکن آفاقی اور منفرد کیفیت ملاحظہ کریں:

جانتا تھا کہ بہت خاک اڑائے گا مری
کوئی آسان نہیں تھا اسے رستہ دینا

مزید اشعار:

اپنے سوال سہل نہ لگنے لگیں اسے
آتے بھی ہوں جواب تو فر فر نہ دی جیو

اک زخم مجھ کو چاہیے میرے مزاج کا
یعنی ہرا بھی چاہیے گہرا بھی چاہیے

جاتے جاتے تری عادت بھی چلی جائے گی
کوئی دن جاتا ہے یہ چھت بھی چلی جائے گی

یہ کوئی قتل تھوڑی ہے کہ بات آئی گئی ہو
میں اور اپنا نظر انداز ہونا بھول جاوں؟؟

کوئی نہیں کہ جس کے گلے لگ کے روئیے
سالا اپَن کے گھر میں کوئی پیڑ بھی نہیں

''سالا اپن''کس قدر برجستگی جدت اور قابلیت سے استعمال ہوا ہے کہ ذرا بھی غیر مانوس نہیں لگتا۔

کیا سچ میں آپ جی نہیں سکتے مرے بغیر؟؟
تو پھر کوئی جواز مہیا نہ کیجیے !!

تا کہ تُو سمجھے کہ مَردوں کے بھی دُکھ ہوتے ہیں
میں نے چاہا بھی یہی تھا کہ ترا بیٹا ہو

جس طرح بھی مجھے خراب کرو
میری سوتیلی ماں دعا دے گی

پھر دیکھنا میں زخم بناتا ہوں کس طرح
تُو بس مرے بدن پہ کہیں اک خراش چھوڑ

کتنے بھاری ہیں ڈوبنے والے
میں کناروں سے باہر آ رہا ہوں

تمام لوگوں نے جب دعا ختم کر لی تو میں نے ہاتھ اٹھائے
مجھے لگا تھا کہ بھیڑ ہے اتنی بھیڑ میں کیا نیا ملے گا

مژدم خان کی شاعری

مژدم خان کے پاس تازہ دم شعری کریفٹ ہے اور ٹیبوز (Taboos) کو توڑنے کا حوصلہ بھی اور اتنی استعداد و مہارت (Talent) بھی ہے کہ وہ الفاظ کو اپنے لمس سے بہار جاودانی بخشتے ہیں، شاید اس عہد بے نور میں یہ اعزاز کچھ کم نہیں۔ یہ طے ہے کہ شعر کا ادائیگی کے علاوہ قرطاسی سطح پر معنوی دھنک بکھیرنا اور دامن دل کو تادیر بلکہ بدلتی رتوں میں بھی کھینچتے رہنا، اس کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور کسوٹی بھی، اور یہی صفتیں اس کے شاعر کے باکمال ہونے کی وافر دلیل ہوسکتی ہے۔

یاد رہے، یہ حروف کو صوت و امکان دینے کا سلسلہ اتنا آسان نہیں ع عمرے باید کہ یار آید بکنار بے شک مژدم خاں، غیر معمولی تخلیقی اپج رکھتے ہیں اور وہ الفاظ کو جدیرتر غزل کے پیرایہ میں آبرو بخشنے کا ہنر جانتے ہیں۔ میں جتنی بار اپنے دل پر دستک دی، حریم دل سے اتنی ہی بار یہی آواز آئی۔ جدت طرازی اور بدیع الاسلوبی کے اعتبار سے مژدم خاں کلام فقید المثال ہے.....ظفر اقبال سے ایک قدم آگے کے شعری تجربات کہو اینٹی غزل یا کچھ اور بھی... ان کے کلام میں ہر طرح کے تجربات شامل ہیں نشان خاطر رہے کہ شاعر کی طبع، چنچل گھوڑے کی طرح ہوتی ہے اسے ایک ہی سمت میں بتکلف چلاتے رہنا ممکن ہوسکتا ہے لیکن ایسی صورت میں وہی پامال اور فرسودہ راستوں کا غبار حاصل سفر ہوگا اور ایسے شعرا کسی نئے جہان شعر میں نہیں پہنچ سکتے اس لئے بڑے

تجربات ،بڑی شاعری کے پیش خیمہ ہوتے ہیں ...بشرطیکہ شاعر انہیں خود پر گزار کر استقلال سے کسی نئی اقلیم سخن میں جہان معانی کے، نئے اور بڑے شہر بسانے میں کامیاب ہو۔

بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن کے قالب میں مژدم خاں کا گرد ونواح بلکہ پورا عصر ہی کروٹیں لیتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ یہاں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مژدم خان کی شاعری جرات اور بیباکی کا ارفع نمونہ ہے۔ظفر اقبال کی طرح ان کے یہاں اینٹی غزل کا رجحان پایا جاتا ہے۔

میرے خیال میں کسی کو ردیدہ ،ملاصفت شاعر یا رسمی نغز گوئی کے حامی کے یہ بس کی یہ بات نہیں کہ وہ Taboos کو توڑ کر شاعری کی چوٹی (pinnacle) کو مسخر کر سکے ۔مژدم خان یہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بے شک" اس صدی کا چیلنج انسانیت کی آزادی ،تکثریت و بوقلمونی کا تحفظ ہے"حقیقی شاعر وہی ہوسکتا جو اگلے تیقنات و تصورات سے اوپر اٹھ کر ادب میں گرانقدر اضافہ کرے۔ورنہ گیسو دراز روایتی شعرا اور خود رو جھاڑ جھنکاڑ کی کچھ کمی تھوڑی ہے۔ بلا مبالغہ کہ رہا ہوں اس شخص سے میری شناسائی تک نہیں البتہ اس کا کلام پڑھ کر محسوس ہوا کہ اس شخص (مژدم خان) میں بڑی شاعری کا ٹیلنٹ موجود ہے۔اگر وہ اسی انحراف و اجتہاد کی راہ پر گامزن رہا اور مصلحت گزیدگی سے بچتا رہا تو یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔بعض تیکھے اور تلخ اشعار۔

مجھ سے پہلے ہی کسی اور سے تھا عشق اسے
ہم اگر ایک بھی ہو جاتے تو ڈھائی ہوتے

غیر اخلاقی شاعری کی طرح
کام آتا ہوں ہر کمینے کے

میں اندھیرے میں بھی تمھارا ہوں
یہی روشن خیالی ہے شاید

کوئی پیشاب کے لئے نکلا
کھل گئے منہ کئی کمینوں کے

وہ ہی مطلق ہے وہ ہی قادر ہے
جیب میں جس کے چار پیسے ہیں

یوں سرِ عام بچھڑنے کی ضرورت کیا تھی
چھوڑنے والوں کی تعداد بڑھا دی تم نے

میری چپ کے ہزار مطلب ہیں
پہلا یہ ہے کہ تو کلام کرے

ہتھیلی اسکی رگڑتے ہی جن نکل آیا
بتانے والا تھا خواہش، کہ دن نکل آیا

جو دور ہیں انھیں وافر چمکنا پڑتا ہے
وگرنہ ان پہ بھی میری طرح نگاہ نہ ہو

علی زیرک اور صحیفہ انجیل کی شاعری

فرزاد علی زیرک:

تماشا ختم ہونے جارہا ہے
ہمارے سانپ ہم کو کھا رہے ہیں

علی زیرک کا یہ شعر پڑھ کر میں حیرت میں ڈوب گیا ہوں کہ شاعر کا تخیل کتنا بلند ہوتا ہے بعض دفعہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو چند الفاظ یا علامتوں میں پیش کر دیتا ہے۔حساس قاری کو ایسے اشعار کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے لیکن اس کی زبان تشریح سے قاصر رہتی یہی عمدہ شعر کی پہچان ہوتی ہے۔علی زیرک نے ہر طرح کے اشعار کہے ہیں۔

آخری بار پکاروں گا اگر آنا ہے
مجھ سے یہ روز کا جھنجھٹ نہیں پالا جاتا

ان دنوں اور کوئی کام نہیں
عشق ہے اور بے تحاشا ہے

ہم مسافر ہیں پکی عمروں کے
چابیاں بھولتے نہیں گھر پر

او پر دئے گئے اشعار میں زبان کی سادگی وسلاست اور خیال کی رعنائی قابل ستائش ہے ۔جس میں " ہنسی کا جھڑنا" اور ذائقہ کا دیر پا ہونا۔اور ان سب پر حافظہ کی فوقیت کو انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔شعر پڑھ کر یقیناً آپ بھی عش عش کر اٹھیں گے۔

ذائقہ یاد رہا اور ہنسی جھڑتی رہی
حافظہ اپنی تسلی میں زباں جیسا ہے

اور پھر نیچے دیئے گئے اس شعر پر بھی:

ابھی تو پہلی ملاقات میں چھلکتی ہے
یہ آنکھ دیکھنا تکیے پہ پھول ٹانکے گی

یہاں آنکھ کا تکیے پر خون رونے کو پھول ٹانکنے سے استعارہ کرنا کس قدر تازہ مثال ہے ۔شعر دیکھیں

محل کے آخری تالے کی دھات کھوٹی ہے
اور اتنی بھیڑ میں رانی کسے سپرد کریں

تالے کی دھات کا کھوٹا ہونا اور بھیڑ ۔اور رانی سب علامتی نظام ہے،اسی طرح نیچے دئے گئے شعر میں کھوٹے سکوں کو گدگروں کے کاسوں کی طرف اچھالنے اور کاسوں کی آواز کو ہنسی کہنا بدیع الاسلوبی کی عمدہ مثالیں ہیں:

کھوٹے سکے مرے بٹوے سے پھسل جاتے ہیں
دور تک بیضوی کاسوں کی ہنسی اڑتی ہے

علی زیرک زود گو شاعر ہیں ۔ان کے یہاں اچھے سے لیکر بہترین اشعار الغرض حسب مراتب ہر قسم کے قاری کو اس کی تسکین کا سامان مل جاتا ہے ۔ان کے بعض

اشعار پہلی قرات میں حساس قاری کا دل موہ لیتے ہیں لیکن ہے۔ان اشعار کے معانی تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ہی کھلتے ہیں۔

صحیفہ انجیل:

انجیل صحیفہ کا نام پہلی بار سنا تو چونک اٹھا کتنا مقدس اور تاریخی نام ہے غور کرنے پر یہ عقدہ کھلا کہ انسان بھی دستِ قدرت کی لکھی ہوئی ایک حقیقی کتاب ... ایک شاعرہ ہے... ان کا یہ نام رکھنے والے والدین کی فراست کو سلام کرتا ہوں۔شعر کہتی ہیں پیکر تراشتی ہیں کہیں کہیں بندش کے بجائے کریفٹ پر ذیادہ توجہ دیتی ہیں. یہ شاعروں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں.. نوعمری میں اگر تخیل کی پرواز کا یہ عالم ہے تو آگے چل کر ان کی شاعری کونٹوں میں گونجے گی:

جو قیمتی بھی ہے،انجیل بھی، مقدّس بھی
وہ اسم خاص ہوں،اس بات کا خیال رہے

ان کے اشعار میں ہجر وفراق کی بو باس رچی بسی ہے اور گلہ شکوہ بھی کرتی ہیں ہے تو منفرد لہجے میں:

کس کے نام کی مہندی؟ کیسی کانچ کی چوڑی؟
میرے سج سنورنے کا، ڈھنگ لے گیا ہے تُو

برف رنگ سے ڈھک کر، منظروں کی عریانی
اس غریب وادی کا ننگ لے گیا ہے تُو

دل کی گمشدگی کا ذکر کتنے نرالے ڈھنگ سے کیا ہے۔

میں برف رتوں کا سپنا تھی تو دھوپ میں رکھ کر بھول گیا
تو میری اذیت کیا جانے میں قطرہ قطرہ پگھلی ہوں

ہاتھ رکھ کے سینے پر، چیخنے لگا ہے جسم
جو بہت ضروری تھا، انگ لے گیا ہے تُو

دل کے مصلے پر کسی نام کی مورت بٹھا کر کے اس کے آگے سر جھکا دیا جائے... تو محبت تمام سرحدوں کو مٹا دیتی ہیں۔ کیا ہی نفیس خیال ہے۔ اور طریقہ اظہار سونے پر سہاگہ۔

تیرے دل مصلے پر، میرے نام کی مورت
سر جھکانے آئے تو، پھر حدیں نہیں رہتیں

یہ سچ ہے کہ اس رشتوں میں بندھی دنیا میں موت کے داغ مفارقت سے بڑا کوئی صدمہ نہیں۔ ان کی شاعری میں بے وقت کی موتوں پر گہرے صدمہ کا جو اظہار ہوا ہے وہ بہت ہی دلنشیں ہے... اور دردناک بھی۔

جب جواں جنازے ہوں، آخری نمازیں ہوں
پھر گلی محلوں میں، رونقیں نہیں رہتیں

باپ نام کی چادر جب سروں سے اٹھ جائے
تیز دھوپ رہتی ہے، راحتیں نہیں رہتیں

ہمارے سماج میں ہو یا کہیں دوسرے معاشرے میں، عورت کا کرب اسکی زندگی کی ریاضت کا محاصل، اس کی خوشی کا راز صرف ایک ہم نفس کے ساتھ مضبوط رشتے میں بندھ جانے پر موقوف ہے۔ اس ہم نفس سے ملنے میں اسے خوشی محسوس ہوتی ہے اور..... اس سے دور رہنے کی حالت میں اس پر اداسی ہی اداسی طاری رہتی ہے۔ یہی حال اس کے Counterpart کا ہوتا ہے۔ ہماری شاعرہ اس طرح کے معاملات کو کس خوش اسلوبی سے نت نئے پیکروں میں ڈھالتی ہیں۔ ذرا آپ بھی

دیکھیں:

مری تمام ریاضت کا ایک حاصل ہے
وہی دعا جو تیرے نام سے جڑی ہوئی ہے
میں تیرے لمس کے جادو سے خوب واقف ہوں
وہ شاخ ہوں جو تیرے ہاتھ پر ہری ہوئی ہے
میں پچھلے سال کی تصویر بھیج دیتی تجھے
مگر یہ ایک طرف سے ذرا جلی ہوئی ہے

دوسری طرف جب کوئی سجیلا جوان اک شوخ وشنگ حسینہ کو اپنی بانسری کے سُروں سے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے تو شاید کچھ سماجی بندھن آڑے آجاتے ہیں ۔رشتہ میں منسلک ہونے کی تمنا میں سرگرداں ہوتے ہوئے بھی اک شوخ و شنگ حسینہ اپنی مجبوری کا اظہار کرتی ہے۔اور کچھ یوں عذر پیش کرتی ہے۔یہ غزل کے اشعار دراصل محبت کے گیت ہیں اور سچی شاعری کے نمونے:

کوئی بانسری والا گاتا ہے، مجھے پربت پار بلاتا ہے
مجھے کام ہیں لاکھوں دنیا کے، میں کیسے وہاں جاسکتی ہوں

کتابیات

کلیات ظفر اقبال (اب تک) جلد اول تا پانچ

کلیات جون ایلیا

شعر آسمان — حکیم منظور

لہو لمس چنار — حکیم منظور

کلیات شہریار

زمین کے قرب — ظفر گورکھپوری

دوسرا شجر — شجاع خاور

غزل پارے — شجاع خاور

کلیات عباس تابش

ایک ذرا سی بارش — پرکاش فکری

بہار غزل — عابد مناوری

یہ عشق ہے — عرفان ستار

سمندر بات کرتا ہے — افضال نوید

اپنے کہے کنارے — نعمان شوق

دیوارِ آب	محمد اظہار الحق
کلیات کمار پاشی	
حشر کی صبح درخشاں ہو	عادل منصوری
کلیات سلیم احمد	
رات اِدھر اُدھر روشن	محمد علوی
نخل آب	رفیق راز
پیش خیمہ	پرتپال سنگھ بیتاب
اشکوں کے چراغ	مضطر عارفی
قوس	سعود عثمانی
آدیش	الیاس بابر اعوان
دشتِ وجود	حمیدہ شاہین
آوازہ مزاج	فرحت عباس شاہ
ستارہ ساز	اختر عثمان
کشید	حسین مجروح
شرق مرے شمال میں	ذوالفقار عادل
شبدوں کا شمشان	علی زیرک